www.urduchannel.in

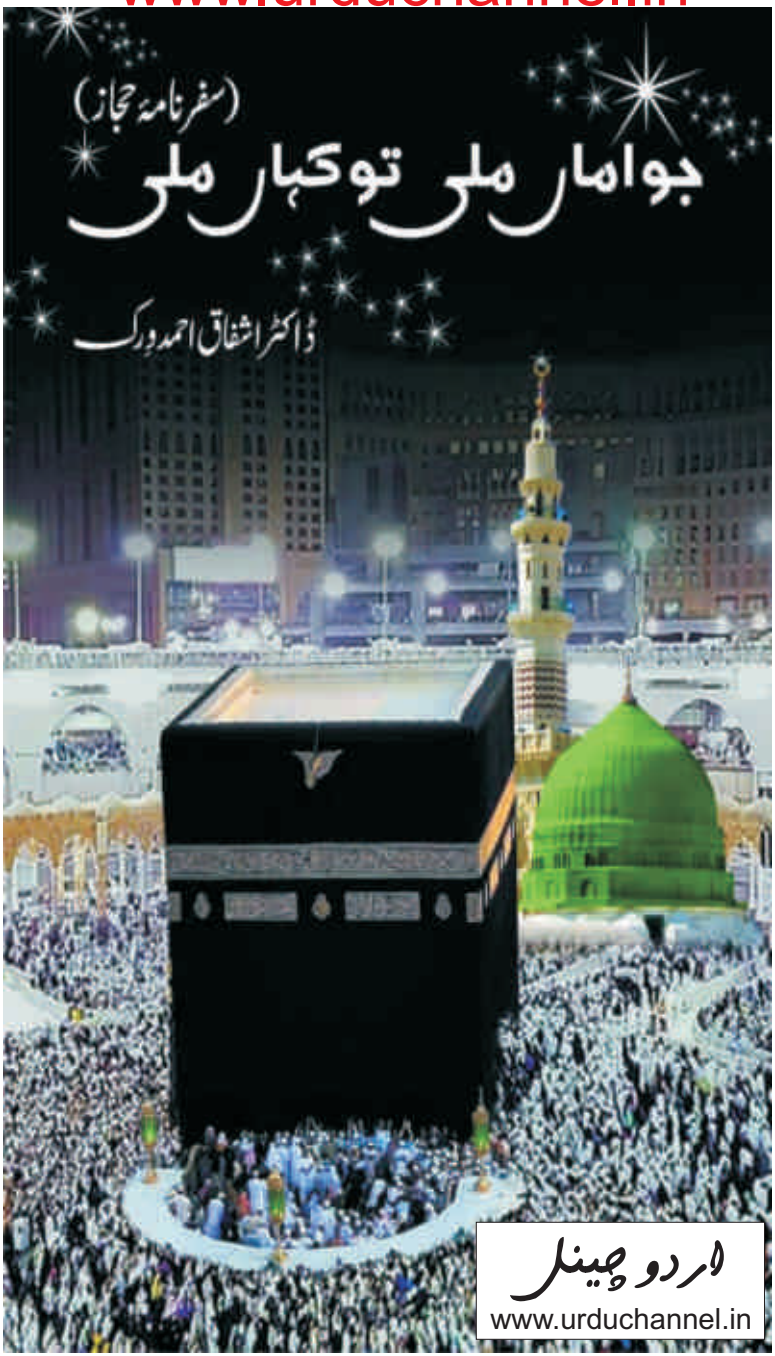

www.urduchannel.in

جو اماں ملی تو کہاں ملی

(سفرنامۂ حجاز)

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک

رنگِ ادب پبلی کیشنز

www.urduchannel.in

نگرانِ اشاعت
شاعر علی شاعرؔ
۰۳۳۶_۲۰۸۵۳۲۵

جملہ حقوق محفوظ ہیں

کتاب	:	جواماں ملی تو کہاں ملی (سفرنامۂ حجاز)
مصنف	:	ڈاکٹر اشفاق احمد ورک ۰۳۲۱_۴۴۳۳۴۳۴ - ۰۳۳۴_۴۴۳۳۴۳۵ drashfaqvirk@gmail.com
سرِ ورق	:	محمد طیب
کمپوزنگ	:	ذوالفقار علی
تزئین کار	:	شیرازی شاعر
اشاعت	:	مئی/۲۰۱۹ء
ناشر	:	رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی ۰۳۴۵_۲۶۱۰۴۳۴ ۰۲۱_۳۲۷۶۱۱۰۰ rangeadab@yahoo.com www.facebook.com/rangeadab
پرنٹر	:	محبوب پریس، کراچی
تعداد	:	۵۰۰
صفحات	:	۱۱۲
قیمت	:	۲۰۰روپے

پبلی کیشن کی جدید ٹیکنالوجی کے مطابق کتاب کی اشاعت کے لیے رابطہ کیجیے:

رنگِ ادب پبلی کیشنز
آفس نمبر ۵-کتاب مارکیٹ، اُردو بازار، کراچی

اِس کتاب کا اجر و انتساب:

ماں جی

کے نام

جن کی سنگت میں مجھے عمرے کا ثواب حج سے پہلو مارتا دکھائی دیا۔

www.urduchannel.in

حُسنِ ترتیب

عرض داشت (مصنف)	5	بطحا کی وادیوں میں	68
منظوری	7	جاتے میں قدم اور تھے	72
روانی اور روانگی	11	حاجیوں کے تعاقب میں	76
صحرائی ہرنیاں	15	اپنا مدار، اپنا مدینہ جدا کرو	80
وہذا البلد الامین	19	آنکھ میں رت جگے مدینے کے	84
توحید کی علامت	23	شاہی مہمان	88
کیا کسی کو، پھر کسی کا	27	بکہ بکہ بکہ	92
زم زم	32	کبھی اے حقیقتِ منتظر	97
تہذیبوں کی کھچڑی	35	زبانِ یارِ من عربی	98
خاک ایسی زندگی پہ	40	کبوتر اور بلیاں	100
خوگرِ پیکرِ محسوس	44	سامان سو برس کا	101
سوئے حرم لے چل	48	دارالغنام	102
من ترا حاجی بگویم	52	مٹی کی محبت میں	103
فرقہ فرقہ کردی نی	56	خروج	105
مرا ایماں ہے زنّاری	60	چلتے چلتے	108
خوش نژاد و خوش نہاد	64	آخری بات	110
مصنف کا ادبی سفر	111	کوائف ڈاکٹر اشفاق احمد ورک	112

0000

عرض داشت

دوستو! ۳۰/اکتوبر ۲۰۰۳ء کو آغاز اختیار کرنے والا یہ مقدس سفر اگرچہ ۵ دسمبر کو تکمیل کی حدود میں داخل ہو گیا تھا، تب تک مَیں نے دنیا جہان کے تقریباً ہر موضوع پر خامہ فرسائی کر رکھی تھی لیکن جانے کیوں اِس سفر میں پیش آمدہ قلبی کیفیات سے الفاظ کے کوزے تراشنے میں میرا خامۂ خوش رفتار پس و پیش سے کام لیتا رہا۔ اِس عالم میں قلم کے چہرے پر کھنڈتی زردی دیکھ کے مجھے عزیز دوست نوید رضا کا یہ شعر یاد آ جاتا کہ:

منتقل کرنا ہے خوابوں کو مگر کیا کیجیے
اتنا سامان تو ڈھویا بھی نہیں جا سکتا

اس مقدس سفر کے تین برس بعد بالآخر کچھ بخت نے یاوری کی، کچھ خامۂ خُفتہ نے پلکیں پٹپٹائیں، کچھ نئے رمضان المبارک کی آمد پر سابقہ رمضان کی یادوں نے سر اٹھایا اور کچھ اخبار والوں نے اُکسایا تو محسوسات کا یہ قسط وار قافلہ روز نامہ دن کے ادارتی صفحے تک رسائی حاصل کرنے میں کامران ٹھہرا۔

۱۳/اکتوبر ۲۰۰۶ء کو اِس کی پہلی قِسط کی کونپل پھوٹی تو دو ماہ یعنی ۱۵/دسمبر تک یہ پودا اکیس شاخوں کا بار برداشت کر چکا تھا۔ سفر تو کب کا مکمل ہو چکا تھا، لیکن سفر نامہ ایک بار پھر بوجوہ یہاں روکنا پڑا..... ارادہ تھا کہ جیسے ہی فرصت کے کچھ لمحات میسر آئے، اِن سنہری یادوں کی تکمیل کر کے انھیں اخبار کے بجائے کتاب کی زینت عطا کی جائے گی..... لیکن بعض احباب نے یہ مشورہ دے کے قلم کو ایک مرتبہ پھر میٹھی نیند سُلا دیا کہ:

''دیر تو جو ہونا تھی، سو ہو چکی، اب خیر سے حج بھی کر آؤ تو
دونوں اسفار کی یادوں کو مجتمع کر کے ایک مکمل اور بڑا سفر نامہ لکھنا۔''

www.urduchannel.in

اِسی انتظار یا سُستی میں ۲۱/اگست ۲۰۱۴ء کو اِس سفر کی محرک اور میری دنیاوی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت، والدہ محترمہ نے بھی اِس دارِ فانی کو مزید درخورِ اعتنا نہ سمجھتے ہوئے، یہاں سے رختِ سفر باندھ لیا۔ محسوس ہوا کہ سورج کے گرد گھومتی اِس زمین نے اپنا محور بدل لیا ہے۔ اب تو اس کتاب کو روز افزوں مصروفیات کی آڑ میں تقریباً آخری فرصتوں کے سرد خانے میں رکھوا دیا۔

اس دفعہ پھر رمضان کی آمد کا چرچا ہوا تو کوئی اندر سے پکارا: بھولے بادشاہو!!!

کام انسان کے تب نمٹتے ہیں
جب کسی کام کا نہیں رہتا

ہوتے ہوتے ایک دن یہ خیال یا وسوسہ تو گویا میرے حواس پر کاٹھی ڈال کے بیٹھ گیا:

ریت کے گھروندے نے
رات بھر ستایا ہے
جب بھی سونے لگتا تھا
نرم رَو خیالوں میں
گرم گرم جذبوں میں
جب بھی کھونے لگتا تھا
روک کر خیالوں کو
ٹوک کر جھمیلوں کو
کان میں وہ کہتا تھا
اِس ذرا سی فرصت میں
کس سے ملنے آیا؟؟؟؟

سودوستو! سفرنامہ حاضر ہے.....

اشفاق احمد وِرک

۱۹/اپریل ۲۰۱۹ء

❁❁❁

منظوری

اکیسویں صدی کے تیسرے سال کو ہوسکتا ہے بعض لوگ تیسرے درجے کا سال سمجھتے ہوں لیکن میرے لیے یہ سال کئی اول درجے کی خوشیاں لے کر آیا۔ پی ایچ۔ڈی کے لیے میرا موضوع ''اردو نثر میں طنز و مزاح'' اگرچہ 1995ء میں منظوری کے تمام مراحل طے کر چکا تھا۔ ڈاکٹر تحسین فراقی کی کڑی نگرانی کے باوجود پونے سات سو صفحات پر مشتمل مقالہ 6 ستمبر 2001ء کو داخل دفتر ہونے کا مسئلہ بھی حل ہو چکا تھا لیکن پنجاب یونیورسٹی کے روایتی تاخیری کلچر کی بنا پر سولہ مہینے تک مقالے کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔

2003ء کے آغاز کے ساتھ ہی جامعہ پنجاب کی جانب سے سندیسہ موصول ہوا کہ آپ نو جنوری کو اپنے کیے کرائے کی جواب دہی کے لیے جامعہ کے شعبہ اردو میں حاضر ہو جائیں۔ یونیورسٹی کے رویے کی دھند چھٹی تو راستے میں موسم کی شدید دھند بال کھولے کھڑی تھی۔ کہر آلود فضا اور جی ٹی روڈ کی قہر آلود ٹریفک سے بچتے بچاتے ہم پروفیسر خرم عباس کی ڈرائیونگ اور پروفیسر خالد ندیم کی معیت میں صبح نو بجے مقررہ مقام پہ جا پہنچے لیکن ہمارے ممتحن کو چونکہ اسلام آباد سے ہوائی ٹریفک کے ذریعے پہنچنا تھا۔ اس لیے ان کی آمد کہیں ڈھائی تین بجے کے قریب ممکن ہوئی۔ مختصر یہ کہ جامعہ ملیہ دہلی کے ڈاکٹر شمیم حنفی اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر نثار قریشی کی تحریری جب کہ مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین جناب پروفیسر فتح محمد ملک کی زبانی آرا کی روشنی میں پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے ہمیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے کا کڑا فیصلہ کر لیا گیا۔ اٹھارہ جنوری کو یونیورسٹی نے اس کا نوٹیفکیشن جاری کر دیا اور چٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق بائیس مارچ کو جامعہ پنجاب کے 113ویں کانووکیشن میں ڈگری جاری کرنے کی رسم بھی ادا کر دی گئی۔

دیگر بے شمار معاملات کی طرح ہماری ذاتی زندگی کا یہ گوشہ بھی پردہ اخفا میں ہے کہ پیغمبرانہ

www.urduchannel.in

یتیمی ہمیں ورثے میں ملی ہے۔ ہماری ایسی ویسی پرورش اور جیسی تیسی تربیت میں والدین کا کردار تن تنہا والدہ محترمہ نے ادا کیا۔ ہماری طبیعت، مزاج اور کردار میں اگر کہیں کوئی صالح گوشہ دکھائی دیتا ہے تو وہ انھی کی عطا ہے۔ باقی بہت کچھ اکتسابی ہے۔ ہماری خاندانی گاڑی کا ایک پہیہ جب حادثاتی طور پر جدا ہوا، والدہ اس وقت نوجوانی کی دہلیز پر تھیں۔ ان کی بیوگی اور میں تقریباً ہم عمر ہونے کی بنا پر آج تک ساتھ ساتھ کھیلتے آئے تھے۔ اگرچہ ان کا یہ انوکھا فرمان ہے کہ والد صاحب کا پیٹی میں سنبھالا ہوا کرتہ جس دن میرے بدن پر ٹھیک ٹھیک پورا آیا تھا، اس دن ان کی بیوگی ختم ہو گئی تھی۔ میرے لیے والدہ کی خدمات اور جذبات اس نوعیت کے ہیں کہ الفاظ تو الفاظ مجھے لگتا ہے کہ مَیں ذرا تفصیل میں گیا تو احساسات و جذبات بھی ہاتھ جوڑ کے کھڑے ہو جائیں گے۔ مجھے قدم قدم احساس رہا ہے کہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا خزانہ ان کے اس ایثار اور عطا کا عوضانہ نہیں بن سکتا۔

یہ حسرت میرے دل میں کسی اِن ڈور (In door) پودے کی طرح پلتی رہی تھی کہ کاش! ان کی کسی بڑی سے بڑی خواہش کی تکمیل میرے ہاتھوں ہو سکے لیکن ان کا رویہ اور قناعت دیکھ کے تو لگتا ہے کہ خواہشات کے پرندوں نے ان کے دل کے شجر پہ اترنا نہ جانے کب کا ترک کر رکھا تھا۔ البتہ خانہ کعبہ اور روضۂ رسول کی زیارت کا تذکرہ کبھی کبھی ان کی آنکھوں میں چمک کا روپ اختیار کر لیتا لیکن شاید میرے محدود مالی وسائل اور لامحدود اخراجات ونخرہ جات کے پیشِ نظر انھوں نے آنکھوں کی اس چمک کو ہونٹوں سے چھلک جانے کا اِذن عطا نہیں کیا لیکن مجھے تو یوں سمجھیں کہ ان کی ایک کمزوری ہاتھ آ گئی تھی۔ ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک درخواست میں نے اللہ تعالیٰ کے حضور کب سے داغ رکھی تھی۔ اپنے تعلیمی سلسلے کی تکمیل کے بعد تو اللہ میاں کو اس درخواست کے حوالے سے یاد دہانیاں (Reminder) بھی دینا شروع کر دیں۔ رمضان کی آمد آمد تھی۔ حالات و واقعات نے نہ جانے آپس میں کس طرح ضربیں تقسیمیں کھائیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے اس خواہش کے پر نکلنا شروع ہو گئے۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں والدہ کا حجِ اصغر کے لیے پرواز کرنے کا مکمل بندوبست ہو گیا۔ حفیظ جالندھری مرحوم نے کہیں لکھا ہے:

شکرِ نعمت بھی کرتا جا دامن بھی پھیلاتا جا

سات دہائیوں کے گرم وسرد چشیدہ (سرد کم گرم زیادہ) والدہ محترمہ کے لیے اس فریضے سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جہاں ایک محرم کی ضرورت تھی، وہیں روحانی بارشوں کے اس دیس میں پیش آنے والی جسمانی مشقتوں کے لیے ایک سہارا بھی درکار تھا۔ ہم جانتے تھے کہ یہ سعادت بزورِ بازو حاصل ہونے والی نہیں چنانچہ اپنی درخواست میں توسیع کی خاطر اس سمیع وبصیر کے ہاں مزید پاؤں پسارے۔ وہ قادرِ مطلق جس کے بارے میں درست طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ آدم سے لے کر آج تک اس روئے زمین پر پیدا ہونے والے ہر جن و بشر کی تمام خواہشات بعینہٖ بھی پوری کر دے تو اس کے خزانے میں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اسی قادر و عادل ہی کا اشارہ تھا کہ اخراجات سے لے کر بیرون ملک سرکاری چھٹی کے جملہ مراحل محدود ترین وقت اور غیر محسوس انداز میں حل ہوتے چلے گئے اور چند ہی دنوں میں خوابوں کی اس سرزمین کی طرف روانگی کا مرحلہ آ گیا۔

مجھے یاد ہے کہ ایک بار جب کسی علمی و ادبی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے میرا انڈیا جانے کا سرسری سا تذکرہ ہوا تھا تو دیکھتے ہی دیکھتے احباب کا ایک جمِ غفیر جمع ہو گیا تھا جنھوں نے فرمائشوں کا ایک طومار باندھ دیا تھا۔ کسی کو وہاں سے کتابیں منگوانا تھیں تو کوئی سونے کا طلب گار تھا۔ بے تکلف دوستوں میں تو فرمائشوں کی فہرست اور ہی رخ اختیار کرتی چلی گئی:

پریتی زنٹا کا ڈمپل
مادھوری کا ٹھمکا
بنارس کی ساڑھی
شملہ کی پہاڑی
بال ٹھاکرے کی دھمکی
بھیگے ہونٹ
چٹی دُدھ کڑی
فوٹو اور بٹوہ
بمبے کی بریانی

www.urduchannel.in

پونا کا پلاؤ
بریلی کے بانس
سُکھ کا سانس
چندی گڑھ کی چاندنی
کولہاپور کی پدمنی
ثانیہ مرزا کا ٹینس بال
تھوڑا بہت تاج محل
گلزار کی فلمیں
کوئی حسرت نہ رہے دل میں

دوست احباب اب بھی جمع ہوئے تھے لیکن اب کے ان کے چہروں پر عقیدتوں کا سیلاب تھا اور ہاتھوں میں دعاؤں کی فہرستیں۔ ہم یہ تمام قیمتی سامان سمیٹے قطر ائیرویز 333 پر محوِ پرواز تھے۔

❁❁❁

6

0000

روانی اور روانگی

شیخوپورہ سے ہماری روانگی 30 اکتوبر 2003 بروز جمعرات بہ مطابق تین رمضان المبارک 1424ھ کو رات ساڑھے گیارہ بجے ہوئی۔ اس وقت ہمارے لیے سب سے مشکل مرحلہ ننھے منے نونہالوں (وجیہا، عائش، نبیہہ) اور ان کی ماں کو کسی کے سپرد کرنے (اس کے لیے ظاہر ہے بچوں کے ننھیال اور ہمارے سسرال سے بہتر کوئی جگہ نہ تھی) اور ان بازبان بچوں سے کم و بیش ایک ماہ کی جدائی کی رخصت طلب کرنا تھا۔ (سب سے چھوٹا پٹاخہ ابھی وجود میں نہیں آیا تھا) خیر ان کی آنکھوں میں اُمڈنے والے سوالات کو ہم پرانی اُردو عبارات میں درآنے والے فارسی، عربی اشعار کی طرح نظرانداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ شیخوپورہ سے حج اصغر پر روانہ ہونے والے ہمارے قافلے میں بارہ چودہ لوگ شامل تھے۔ یہ مرد و زن مختلف طبقوں اور عمروں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سرکاری ملازم بھی تھے، گھریلو خواتین بھی اور خالص کاروباری حضرات بھی۔ ان میں بعض لوگ تو ہماری طرح اس مقدس سفر پر پہلی مرتبہ روانہ ہو رہے تھے لیکن بعض کا شمار ان عادی حجاج کرام میں ہوتا تھا جن کے بارے میں معروف شاعر جناب جعفر بلوچ نے ایک زمانے میں نہایت لطیف اور اہم سوال اٹھایا تھا کہ:

فرض تھا اک حج، ادا تو نے کیا اچھا کیا
تجھ سے جو رب نے کہا، تو نے کیا اچھا کیا
حق سے اظہارِ وفا، تو نے کیا اچھا کیا
پاسِ شرعِ مصطفیٰؐ تو نے کیا اچھا کیا
دوسرے حج سے ہے لیکن اک تجاوز رونما
خیر سے تو دوسرے حج کو چلا

www.urduchannel.in

وہ بھی ہیں، اک بار بھی جو حج کو جا سکتے نہیں
یعنی اک حج کے بھی اخراجات اٹھا سکتے نہیں
آتشِ شوق اپنے دل کی وہ بجھا سکتے نہیں
ان کے دل پر جو گزرتی ہے بتا سکتے نہیں
تو نے ان افسردگاں کو اور اک چرکا دیا
خیر سے تو دوسرے حج کو چلا

تیرے گرد و پیش کتنے بے زر و نادار ہیں
خستہ و بدحال ہیں، محتاج ہیں، بیمار ہیں
لڑکیاں ناکت خدا، وقفِ غم و آزار ہیں
کتنے مفلس ہیں کہ اپنی جان سے بے زار ہیں
تیرے فاضل مال پر حق پہلے ان لوگوں کا تھا
خیر سے تو دوسرے حج کو چلا

تو اگر حاجی ہے سرکاری، تو کیا تجھ سے کہوں
ہے خیانت سے تیری یاری تو کیا تجھ سے کہوں
یونہی پھر حج کی ہے تیاری تو کیا تجھ سے کہوں
یوں تو حج کرنا نہیں کوئی حمیت آشنا
خیر سے تو دوسرے حج کو چلا

اس بات میں تو رتی بھر مبالغہ نہیں کہ ہمارے ہاں بعض کاروباری حضرات تو اپنی دکان پہ ''حاجی دی ہٹی'' لکھوانے کی غرض سے یہ مالی وسفری صعوبتیں برداشت کرتے ہیں۔ دورانِ سفر کچھ لوگوں کے بارے میں یہ اطلاعات بھی موصول ہوئیں کہ وہ سفری ایجنٹوں کے باقاعدہ حصے دار ہیں۔ وہ سال بھر اپنی دکان پر آنے والے گاہکوں بالخصوص بزرگ خواتین وحضرات کو قربِ قیامت کا احساس دلا کر اپنے حج وعمرہ گروپ میں شامل کرتے ہیں اور پھر انھی کے پلے سے میلہ دیکھ کر اگلے سال کے لیے آواز میں سوز اور لہجے میں مزید رقت پیدا کر لیتے ہیں۔ اس روایتی خان

صاحب کا قصہ تو آپ نے یقیناً سنا ہوگا، جو حج سے واپسی پر سیدھا محلّے کی دکان پر گیا اور اپنے ادھار کھاتے والا رجسٹر طلب کیا۔ دکان دار بہت خوش ہوا کہ چلیں حج کا یہ فائدہ تو ہوا کہ ڈوبی ہوئی رقم واپس آ جائے گی۔ چنانچہ اس نے جھٹ بہی کھاتہ حاضر کیا۔ خاں صاحب نے اس میں اپنے نام والا صفحہ نکلوایا اور حکماً فرمایا: ''خوچہ اس میں ہمارے نام کے ساتھ 'حاجی' لکھ لو۔''

ہمارے قافلے میں بھی ایک حاجی صاحب نے کمال فنکاری کی بات بتائی۔ ان کی بیٹی جو کسی سکول میں ہیڈ مسٹریس تھیں، اُنھوں نے گزشتہ سال رمضان المبارک کا پورا مہینہ حجاز مقدس میں عبادات اور زیارات کرتے گزارا لیکن سکول سے ایک دن بھی غیر حاضر نہیں ہوئیں۔ اس کراماتی غیاب وحضور کی تفصیل انھوں نے یہ بتائی کہ ان کی ذہین وفطین دخترِ نیک اختر نے سکول کے بعض ضروری کاغذات پر پیشگی دستخط فرما لیے، اپنی روزانہ کی حاضری لگانے کے لیے کسی جونیئر استانی کو پابند کیا۔ ہنگامی حالات کے لیے کچھ سادہ کاغذات سائن کیے۔ بقیہ فریضہ انھوں نے واپسی پر ادا کر لیا۔ محکمے کو اس کی ہوا تک نہ لگنے دی۔ شاعر نے غالبًا ایسے ہی فنکار لوگوں کے لیے فرمایا تھا کہ:

رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی

حرمین شریفین کے لیے روانہ ہونے والے اس قافلے کے چہروں پر ایک کیفیت طاری تھی۔ نوخیز اور نو واردان کے چہروں پر جذب وشوق کی ایک لہر تھی جب کہ تجربہ کار لوگوں کے لہجے میں اعتماد اور کاروباری رنگ تھا۔ ہمارے قریبی گروپ کے دو چار لوگوں کو دو تین گھنٹے تو لاہور میں بعض اقربا کو ملنے میں صرف ہوئے۔ رات کے اڑھائی تین بجے علامہ اقبال ائیر پورٹ پہنچے۔ ایجنٹ کی ''کاروباری ذہانت'' کی بنا پر ہماری سیٹیں براہِ راست جدہ یا مدینہ جانے والی کسی پرواز کی بجائے قطر ائیرویز میں بک ہو سکی تھیں۔ ہم نے اس سفری طوالت سے منھ کا ذائقہ خراب کرنے کی بجائے اس چالاکی کو بھی ''ایک ٹکٹ میں دو مزے'' والے کھاتے میں ڈال دیا۔

ائیر پورٹ کے اندر داخل ہونے کے بعد سب سے پہلا مرحلہ کرنسی تبدیل کرنے کا تھا۔ ائیر پورٹ انتظامیہ کا باوردی عملہ نہایت مستعدی اور فرض شناسی کے ساتھ مسافروں کی تمام کرنسی کو سعودی ریالوں میں تبدیل کرنے کے حکم نما مشورے سے نواز رہا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس

www.urduchannel.in

فرض شناسی کے پیچھے بھی ہمارا روایتی کمیشن کلچر کارفرما تھا۔ خیر ہم نے بھی ان کی مستعدی اور مشوروں سے متاثر ہوکر اپنی کل جمع پونجی انیس ہزار پاکستانی روپوں کے عوض 1172 سعودی ریال حاصل کر لیے۔ اندر ہی اندر اپنے پیارے پاکستانی روپے کے اس قدر ہلکے پن پر سبکی بھی محسوس ہوئی۔

مذکورہ ہوائی اڈے کے اندر سحری کا انتظام قطر ائیرویز کی جانب سے تھا۔ کچھ روایتی کھانے لاہور کے احباب نے بھی ساتھ کر دیے تھے۔ ہم نے دونوں طرح کے کھانوں کو ملا جلا کر سحری کھانے کا سلسلہ مکمل کیا۔ نماز فجر بھی ائیر پورٹ ہی کی نماز کے لیے مخصوص کی گئی جگہ پر ادا کی۔ اس دوران اپنا اپنا سامان جمع کروانے اور دیگر کاغذی امور انجام دینے کا سلسلہ بھی تکمیل کو پہنچ گیا۔ ہماری یہ پرواز لاہور سے صبح پانچ بجے روانہ ہوئی جہاز نے کچھ ہی دیر بعد طلوع ہوتے سورج کی مخالف سمت میں دوڑ لگا دی۔ یہی وجہ ہے کہ جہاز اگرچہ ساڑھے تین گھنٹے میں دوحہ ائیر پورٹ پہنچا لیکن وہاں ابھی صبح ساڑھے چھ بجے کا وقت ہوا تھا کیونکہ جہاز کے سورج سے مخالفت سمت میں بھاگنے کی پاداش میں گھڑی کی سوئیاں دو گھنٹے پیچھے جست لگا چکی تھیں۔

ہمارا یہ بیرون ملک پہلا سفر تھا اور خدا کا شکر ہے کہ ارضِ مقدس کی جانب تھا۔ علامہ شبلی نعمانی سے تمام عمر مسلم زعما کی سوانح عمریاں لکھنے کے بعد جب سیرۃ النبی ﷺ پر کام شروع کیا تو فرمایا تھا:

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیمِ آستانِ غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں، سیرتِ پیغمبرِ خاتم
خدا کا شکر ہے، یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

لیکن حالیہ صورت حال کے مطابق میرے ہونٹوں پر یہ الفاظ تھے:

خدا کا شکر ہے یوں سلسلہ آغاز ہونا تھا

❁❁❁

صحرائی ہرنیاں

جہاز ابھی فضا میں بلند ہوا ہی تھا کہ قطر ائیرویز کی ائیر ہوسٹس سرخ سکرٹ دھاری دار شرٹ اور دھار دار اداؤں کے ساتھ رواں ہوگئیں۔ ایک طرف ٹی وی سکرین پہ بار بار قطر ائیرویز کا سلوگن دکھایا جا رہا تھا جس میں صحرائی ہرنیاں قلانچیں بھرتے بھرتے ہوائی طیاروں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں لیکن جہاز کے اندر بیٹھے بیٹھے یہ محسوس ہوا تھا کہ ان میں سے بعض ہرنیاں ایک عدد مزید جست لگا کے جہاز کے اندر داخل ہوگئی ہیں اور انھوں نے دھاری دار لباس زیب تن کر لیا ہے۔ سیٹوں کی دو قطاروں کے درمیان چھوڑے گئے راستے سے بظاہر ایک آدمی کا گزرنا مشکل دکھائی دیتا تھا لیکن آمنے سامنے سے آتی ہوئی دو ہرنیاں ایک دوسرے کے پاس سے اتنی سہولت اور رفتار سے گزر جاتیں کہ ٹرینوں کی ٹکر دیکھنے کے شوقین زبان دانتوں میں انگلیاں داب کے رہ جاتے۔ مرزا غالب کے زمانے میں ابھی قطر ہوائی کمپنی کا آغاز تو نہیں ہوا تھا لیکن اس چال کی چاپ لگتا ہے انھیں ڈیڑھ سو برس پہلے سنائی دینے لگی تھی اس لیے وہ کہہ گئے تھے:

دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی

جہاز میں بعض بیبیاں بعض بابوں کو بیلٹ باندھنا سکھا رہی تھیں۔ ان میں کئی بابے ایسے تھے جنھیں تمام عمر تہمد، پگڑی اور نیت باندھنے کے علاوہ کچھ باندھنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ بعض فضائی میزبانیں ہنگامی حالات میں پیراشوٹ کھولنے کی ترکیب بتائے جا رہی تھیں۔ کہیں پہ ٹی وی لگانے، بند کرنے یا چینل بدلنے کے گراز برکرائے جا رہے تھے۔

جہاز کے تمام مسافروں کا رخ اور منزل خانہ کعبہ نہیں تھی ان میں سے بعض کی منزل قطر ہی تھی اور بعض کو دوحہ سے کانٹا بدل کے دیگر ممالک کی طرف پرواز کر جانا تھا اس لیے تمام مسافروں

www.urduchannel.in

کے روزے سے ہونے کی گارنٹی نہیں تھی لیکن پرواز کا وقت ایسا تھا کہ اس میں کھانے پینے کے معاملات کو بالعموم نہیں چھیڑا جا سکتا تھا۔ ناشتے کے طلب گاروں کو دوحہ ائیر پورٹ کے لیے کارڈ جاری کر دیے گئے تھے ابھی سورج نے زمانے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے گھورنا بھی شروع نہیں کیا تھا کہ جہاز نے لاہور سے دوحہ تک کی چھلانگ مکمل کر لی۔ ویرانی میں دوحہ کا ہوائی اڈہ بھی لاہور کے علامہ اقبال ائیر پورٹ کا کلاس فیلو ہی لگتا تھا جس کے چاروں جانب اداسی بال کھولے سو رہی تھی جہاز کے قدم زمین پر جمتے ہی ائیر پورٹ کی مخصوص بسیں مسافروں کو ویٹنگ لاؤنج تک لے جانے کے لیے ملتمس تھیں۔ یہ ویٹنگ لاؤنج کیا تھا، مختلف تہذیبوں کا مرثیہ تھا اور ارض مقدس کے مسافروں کا پہلا امتحان بھی کیونکہ ننگی پنڈلیوں، عریاں کمروں، شفاف پیٹوں، چست سکرٹوں اور ست بکنیوں کا مینا بازار لگا ہوا تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اسی لاؤنج میں ہمیں پانچ سے سات گھنٹے قیام کرنا تھا۔

لاہور، شیخوپورہ میں ہوتے تو شاید ایسے مناظر کی فوٹو کاپیاں کروا کے رکھ لیتے۔ کسی عمومی سیاحت پہ نکلے ہوتے تو دمِ تحریر ان پنڈلیوں اور بکنیوں کو آٹھ دس سے ضرب دے کے اپنا من برماتے، قارئین کو للچاتے، مبالغہ کمپنی کے مصالحہ جات کا حسب ضرورت چھڑکاؤ کرتے اور پھر غلو کی چٹخارے دار چٹنی کے ساتھ اخبار کے دسترخوان پر اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر دیتے تو سفر نامے کے اس ویرانے میں چپکے سے بہار آ سکتی تھی لیکن آپ کو سچ بتاؤں کہ خدائے عزوجل کی کرم فرمائیوں کی پھوار میں ہماری عقیدت کے پراتنے بھیگے ہوئے تھے کہ اس جولان گاہ میں تخیلاتی یا عملی اڑن بھرنے کی خواہش تک بھی دل میں پیدا نہ ہو سکی اور ہم خانہ خدا کے دیدار کی شدید خواہش اور احساس تشکر کا دامن تھام کر اس خرابے میں مسجد کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور تھوڑی ہی دیر میں ہم فارسی محاورے ''جوینده یابنده'' (جس نے ڈھونڈا اس نے پا لیا) کے مصداق بعض تیروں کے نشانات کی مدد سے ایک ایسے قالین یافتہ کمرے کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئے جسے مسجد کی خالی پوسٹ پہ تعینات (Depute) کیا گیا تھا۔ اس کمرے میں مختلف تہذیبوں کے چار پانچ افراد ایک ہی انداز میں بے سدھ سوئے پڑے تھے۔ ان سب کے رنگ اور لباس ایک دوسرے سے جدا تھے، یقیناً تہذیب اور زبان بھی مختلف ہو گی لیکن ان سب کی خراٹوں کی لینگویج

مشترکہ تھی۔ اس کمرے کے ایک کونے میں پڑے سائیڈ ریک میں قرآن پاک کے چند نسخے پڑے تھے۔ ہم نے سرخ جلد والا ایک نسخہ تھاما اور خدائے بزرگ و برتر کی اس عظیم تخلیق کی فیوض و برکات میں کھو گئے۔ پپوٹے نیند سے بوجھل ہونے لگے تو اس عظیم نسخے کو واپس ریک میں رکھا اور چند ہی لمحوں بعد ہم بھی اس سوئے ہوئے ماحول کا حصہ بنے خراٹے خراٹے کھیل رہے تھے۔

آنکھ جب طلوع ہوئی تو سورج ڈھلنے کے آثار نمایاں تھے۔ آج چونکہ جمعۃ المبارک تھا چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں وہ مختصر سا کمرہ گورے، کالے اور سانولے مسلمانوں سے چھلک رہا تھا، ہمارے عمرہ گروپ کے تقریباً تمام مرد اس بین الاقوامی اجتماع میں شامل تھے۔ مختصر سا خطبہ ایک عربی جوان نے دیا اور اس کے بعد:

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

اگرچہ اکتوبر کی آج آخری تاریخ تھی لیکن تاحال گرمی ''ابھی تو میں جوان ہوں'' کا راگ الاپ رہی تھی۔ مسافر لاؤنج سے باہر گرمی اور اندر گرما گرمی کا احساس شدید ہوتا جا رہا تھا کہ ہمارے تجربہ کار ہم سفروں نے بتایا کہ ہماری جدہ جانے والی پرواز پر تول رہی ہے۔ اس لیے ہمیں جلد از جلد احرام باندھنے کا مرحلے طے کر لینا چاہیے۔ چنانچہ اپنے اپنے بیگوں سے سفید لٹھے کی دو دو چادریں برآمد کی گئیں جو وطنِ عزیز سے اسی مقصد کے لیے خریدی گئی تھیں۔ یہ چادریں تھامے ہوئے ہم مسافر خانے کے لشکارے مارتے غسل خانوں میں گھس گئے وہاں عمر بھر کے روایتی لباس کو الوداع کہہ کر سنت طریقے سے غسل کیا، جب غسل خانے سے برآمد ہوئے تو ہماری جون بدل گئی تھی۔ غالب ایک بار پھر بے طرح یاد آیا:

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

اسی موضوع پر ہمارے خوبصورت پنجابی شاعر جناب انور مسعود کا بھی کیسا خوبصورت شعر ہے کہ:

روز ازل توں ننگے پنڈے آؤندا اے ایس جہانے
بندہ اک کفن دی خاطر کنا پینڈا کردا اے

www.urduchannel.in

شاید اس احرام کا مقصد بھی آخرت کو بھولے ہوئے انسان کے اندر موت کے احساس کو تازہ کرتا ہے۔ اس لباس اور اس کے احساس کو اپنے اوپر طاری کر کے انسان کو واقعی محسوس ہوتا ہے کہ اس کے اندر کشش ثقل کی مقدار خاصی کم ہوگئی ہے۔ صرف احرام کے نیچے پہنی ہوئی بیلٹ کے اندر پڑے ہوئے پاسپورٹ اور کڑکڑ کرتے ریال دنیاداری سے رابطے کا کسی حد تک احساس دلاتے رہتے ہیں۔ اس علامتی کفن پوشی کے تھوڑی دیر بعد ہی ہم اللھم لبیک کا ورد کرتے ہوئے قطر ائیرویز کی پرواز نمبر 767 میں سوار ہوئے، ہمارا اگلا پڑاؤ جدہ میں تھا۔

❁❁❁

وہذا البلد الامین

دوحہ سے جدہ جانے والی پرواز ابھی فضا میں بلند ہوئی تھی کہ جہاز کی ٹی وی سکرین پر خانۂ خدا کی تصویر رونما ہوگئی۔ ان معلومات کے ساتھ کہ اس وقت ہم اس پُرکشش منزل سے کتنے فاصلے پر ہیں اور یہ کہ بیت اللہ ہمارے کس رُخ پر ہے۔ ہر لمحہ اس مقدس ترین منزل سے قریب ہونے کا احساس ایسا روح پرور تھا کہ اس کے بیان کی منزل سر کرنے کے لیے الفاظ کا نازک شانہ ناکافی محسوس ہوتا ہے۔ بار بار یہی خیال ذہن وقلب کے قدموں سے لپٹ لپٹ جاتا تھا کہ:

وہ اللہ کی بستی قریب آ رہی ہے
وہ رحمت وہ مستی قریب آ رہی ہے

اسی تصور سے سرشاری کشید کرتے کرتے ہمارے جہاز نے بالآخر خوابوں کی اس سرزمین پر بوسہ ثبت کر دیا۔ دھاری دار ہرنیوں نے سلیقے کے ساتھ مسافروں کو الوداع کہا۔ جدہ ائیر پورٹ کی عمارت میں پہنچے تو اپنے اپنے سامان کی ڈھنڈیا پڑی۔ جو سروسامان ہم گھر سے لے کر چلے تھے اس کے لیے ''سروسامان'' کی بجائے بے سروسامانی کے الفاظ زیادہ موزوں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جانچ پڑتال کے مرحلے سے ہم شتابی سے فارغ ہوئے۔ پورے سفر میں ایک چیز کا بار بار احساس دلایا جاتا رہا کہ سعودی عرب میں منشیات لے کر جانے کی سزا موت ہے لیکن الفت وعقیدت کا جو نشہ ہم اپنے دل کے بریف کیس میں رکھ کے لائے تھے وہ امیگریشن یا ہوائی اڈے کی انتظامیہ کی مشینوں کی پکڑ سے باہر تھا۔

اسی ائیر پورٹ سے ہمیں بسوں کے ذریعے امن والے شہر مکۃ المکرّمہ روانہ ہونا تھا لیکن اس سے پہلے ائیر پورٹ پر افطار کا انتظام تھا۔ وہ روزہ جس کی بنیاد لاہور ائیر پورٹ پر رکھی گئی تھی وہ تین ملکوں سے بہلتا ٹہلتا ہوا آ کے جدہ ائیر پورٹ پر تکمیل کو پہنچا۔ افطار کے بعد مغرب کی نماز بھی

www.urduchannel.in

یہیں پر ادا کی گئی اور پھر یہ قافلہ ایک بس کے ذریعے سرزمینِ بطحا کی جانب رواں دواں ہوا۔ جتنی دیر میں بس نے ایک ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت طے کی اتنے ہی دورانیے میں رَخشِ تخیل صدیوں کی زقند بھر چکا تھا۔ اب ہماری بس اس شہر میں داخل ہو رہی تھی جہاں آج سے کئی ہزار سال قبل عراق میں ''اُر'' کے مقام پر پیدا ہونے والے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حکمِ ربی سے بیت اللہ کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک عرصہ نمرود سے برسرِ پیکار رہے۔ نمرود نے آپ کو آگ میں پھینکنے کا حکم دیا تو وہ آگ اللہ کے حکم سے سرد ہوگئی۔ اس کے بعد آپ اسلام کی عالم گیر دعوت کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ آپ نے اپنی تبلیغ کے دو بڑے مراکز فلسطین میں جبرون اور حجاز میں مکہ کے مقام پر قائم کیے۔ پہلے مرکز پر اپنے بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یوسف علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت یحییٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسی بیٹے کی نسل میں سے تھے۔ دوسرا مرکز آپ علیہ السلام نے اپنے فرزند ارجمند حضرت اسماعیل علیہ السلام کے سپرد کیا۔ عرب کے تمام قریش اور بالخصوص خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ انھی کی اولاد میں سے ہیں۔ گویا دنیا کے تمام بڑے مذاہب کے بانی اور توحید کے سب سے بڑے پرچارک حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی ہیں اس لحاظ سے یہودی، عیسائی اور مسلمان خاندانی اعتبار سے بھی ایک دوسرے کے کزن ہیں۔ ان میں یہودی اور عیسائی آسمانی صحیفوں میں ردو بدل کرنے کی وجہ سے جادۂ اُخروی بھٹک گئے اور مسلمان قرآن اور پیغمبر کی تعلیمات سے دور ہونے کی بنا پر اس دنیائے فانی میں بھی رسوا ہیں۔

یہ وہی شہر ہے جو شروع دن سے عرب دنیا کا سب سے بڑا روحانی و تجارتی مرکز ہے۔ اسی مرکز کو اپنے ہاں منتقل کرنے کے لیے یمنی سپہ سالار ابرہہ نے ہاتھیوں کے لشکر کے ساتھ چڑھائی کی تو وہ ایسے ہو گیا جیسے کھایا ہوا بھُس۔ مشہور واقعہ ہے کہ مکہ سے باہر ابرہہ کے سپاہیوں نے آنحضور ﷺ کے دادا عبدالمطلب کے چالیس اونٹوں کو قبضے میں لے لیا۔ عبدالمطلب جب مکہ شہر سے باہر، ابرہہ سے ملنے کے لیے آئے تو وہ کم بخت سمجھا کہ شاید صلح یا معافی کی درخواست لے کر

0000

آئے ہیں۔ استفسار پر جناب عبدالمطلب نے فرمایا: اپنے گھر کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے رکھی ہے، میں تو اپنے گم شدہ چالیس اونٹوں کا حساب مانگنے آیا ہوں۔

یہ وہی شہر ہے جہاں سے صداقت، امانت، دیانت، ریاضت اور دعوت کے بھرپور ترپن سال گزارنے کے بعد رحمۃ العالمین کو بے یار و مددگاری کے عالم میں ہجرت کرنا پڑی تھی اور چند سال بعد عرب کے فاتح کی حیثیت سے آپ ﷺ واپس تشریف لائے تھے اور یہ شہر، امن والا شہر قرار پایا تھا۔

ہمارے منتظمین نے جس ہوٹل میں ابتدائی پانچ دن قیام کرنے کا بندوبست کر رکھا تھا اسے ڈھونڈنے میں ہماری بس والوں کو دقت پیش آ رہی تھی۔ اسی تلاش میں ہمیں تقریباً تمام شہر کی سیر کرا ڈالی گئی۔ خدا خدا کر کے ہم الزورا ہوٹل پہنچے، جو بیت اللہ سے بارہ منٹ کی پیدل مسافت پر تھا۔ اپنا سامان کمروں میں بند کرنے کے بعد قافلہ اصل منزل کی جانب روانہ ہوا، جہاں خدا خود بندے کا میزبان بنا بیٹھا تھا۔ اس گھر کی زیارت میں جو کیفیت ہم نے محسوس کی، آیئے پہلے اسے معروف شاعر جناب منیر سیفی کی آنکھ سے دیکھتے ہیں:

اِس بار میرے دل میں تھا غم اور طرح کا
اِس بار ہوا مجھ پہ کرم اور طرح کا
اِس بار ہوئی مجھ پہ کوئی اور ہی بارش
اِس بار ہے مجھ خاک میں نم اور طرح کا
اِس بار پذیرائی ہوئی اور طرح سے
اِس بار قصیدہ ہوا رقم اور طرح کا
پہلے تو نکل جاتے ہیں بل سارے وہاں پھر
گردن کو عطا ہوتا ہے خم اور طرح کا
جاتے ہوئے اٹھتے تھے قدم اور طرح سے
آتے ہوئے پڑتا تھا قدم اور طرح کا

www.urduchannel.in

نکلے جو سبھی بت تو کہیں جا کے ملا تھا
کعبے کے تناظر میں صنم اور طرح کا
ہر بار نگاہوں پہ کھلے اور ہی عالم
ہر بار نظر آئے حرم اور طرح کا
لکھے تھے نگاہوں سے فضاؤں میں عریضے
تھی لوح وہاں اور، قلم اور طرح کا
اس شہر کے آثار نظر آتے ہی سیفی
ہو جائے وجود اور، عدم اور طرح کا

❁❁❁

0000

توحید کی علامت، پہلا وہ گھر خدا کا

مکہ سنگلاخ پہاڑوں کا شہر ہے۔ یہ تمام آبادی پتھروں کا کلیجہ چیر کے بسائی گئی ہے۔ اس کے بازاروں کا خم اور سڑکوں کے نشیب و فراز پہاڑوں کے مزاج کا آئینہ دار ہیں۔ یہ وادی ازل سے سنگریزوں اور سنگ دلی کے لیے مشہور ہے۔ قدرت کے فیصلے بھی غضب کے ہوتے ہیں، اُس نے بھی دنیا کی سب سے حلیم، صدیق، امین، رحیم اور نرم خو ہستی کو پتھریلے ترین علاقے اور لوگوں کے درمیان پیدا کیا، جن کی استقامت، مستقل مزاجی اور زندہ دلی نے چٹانوں کو سر کنے اور پتھر دلوں کو پگھلنے پر مجبور کر دیا۔ استادِ محترم ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کا ایک شعر ہے:

دل کا پتھر پگھلے تو کیا نکلے گا
پتھر کا دل پگھلا تو دریا نکلا

خواجہ الطاف حسین حالی نے اپنی شہرہ آفاق نظم ''مدوجزر اسلام'' جو اُردو دنیا میں ''مسدس حالی'' کے نام سے معروف ہے، میں اسی وادی کے بارے میں لکھا تھا:

گھٹا ایک پہاڑوں سے بطحا کے اٹھی
پڑی چار سو یک بہ یک دھوم جس کی
کڑک اور دمک دور دور اس کی پہنچی
جو ٹیگس پر گرجی تو گنگا پر برسی
رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

ہوٹل سے حرم تک ہم نسبتاً فراخ گلیوں اور سڑکوں پر خراماں خراماں چلتے ہوئے پہنچے۔ حرم کا فاصلہ قدم بہ قدم کم اور دل کا اشتیاق لحظہ بہ لحظہ زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ دل بار بار ہاتھ سے نکلا جا رہا

www.urduchannel.in

تھا۔دل ہمارے بس میں نہیں تھا اور اگر دل کے بس میں ہوتا تو سینے کی دیوار مسمار کر کے بھاگ کھڑا ہوتا:

اس کو ملنے چلے تو دل اپنا
ہم سے پہلے روانہ ہو گیا ہے

اسی کیفیت کو چند سال قبل ہم نے غزل کے ایک شعر میں یوں بیان کیا تھا:

یہ میرا دل تو مرے پاؤں پڑ گیا کل شام
یہ مجھ سے بڑھ کے ترے ہاں رسائی چاہتا ہے

ایک طرف خدائے بزرگ و برتر کے گھر کی کشش تھی اور دوسری جانب بزرگوں کا ساتھ تھا۔ سودھیان کہیں تھا، قدم کہیں تھے۔ کچھ ایسے ہی عالم میں ہم باب فہد کی جانب سے حرم میں داخل ہوئے۔ نیچے پتھر کے وسیع و عریض فرش کی قدموں سے لپٹی خنکی دماغ تک پر پھیلائے ہوئے تھی اور اوپر مسجد حرام کے مینار اور ہوٹلوں، پلازوں کی فلک بوس عمارتیں ایڑیاں اٹھا اٹھا کر اپنا قد بڑھانے میں لگی ہوئی تھیں۔ باب فہد کے عین سامنے مکہ کی غالباً سب سے اونچی عمارت ''دار التوحید انتر کانتی نینتل'' اور اس سے متصل ''شرکۃ المکہ'' تو حرم کے اندر ہی شامل ہیں۔ اس عمارت کا ایک فلور نماز کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے یہاں پر مقیم لوگ رش سے بچنے اور دوسروں کو بچانے کے خیال سے یہیں پنج وقتہ نماز با جماعت ادا کرتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ہم ''**اللھم لبیک**'' کا ورد کرتے باب فہد سے اندر داخل ہوئے تو جدید طرز تعمیر کے نمونوں نے دل میں گھر کرنے کی اپنی سی پوری کوشش کر ڈالی۔ منقش ستون، مزین راہداریاں اور لشکارے مارتے فرش قلب و نظر کا راستہ روکے کھڑے تھے لیکن ہماری آنکھوں میں کوئی منظر بھلا کیسے جچتا، ہماری نظریں تو اس منظر اور منزل کو پا چکی تھیں۔ ہم ہزاروں میل دور سے جس کے دیدار کی حسرت لے کر وہاں پہنچے تھے اور دنیا بھر کے ڈیڑھ ارب فرزندان توحید جس کو اپنی آنکھ کا سرمہ بنانے کے لیے ہر گھڑی بے چین رہتے ہیں۔ اللہ کا یہ گھر کئی ہزار سال سے مرجع خلائق ہے، چودہ سو سال سے مسلمانوں کے لیے بے پناہ کشش کا باعث ہے اور قیامت تک اس کی مقبولیت، تقدس اور کشش میں کمی آنے کا کوئی امکان نہیں۔ خانۂ خدا کا یہ طلسماتی منظر تھا کہ ہماری پتلیوں

0000

میں گھس گیا تھا، پلکوں کا جھپکنا قصۂ دیرینہ و پارینہ بن چکا تھا۔ حیرت، محبت اور عقیدت کے دریاؤں میں نہایت اونچے درجے کا سیلاب تھا جو کہیں کہیں آنکھوں کے کناروں سے چھلکا پڑتا تھا، محویت کا وہی عالم تھا کہ:

یہ نظریں اسی در پہ جمی ہیں تو جمی ہیں

اس کالے چوکور کوٹھے کی سادگی ایسی ہے کہ جہاں ہزاروں رنگینیاں اور پرکاریاں پانی بھرنے آتی ہیں۔ یہ آٹھ دس گز اونچا کمرہ کہ جس کے سامنے بڑے بڑے مینار، فلک بوس پلازے اور رفیع الشان ہوٹل لگتا ہے گردن اکڑا اکڑا کے اپنی ہیبت کا احساس دلانا چاہ رہے ہیں لیکن اصل عظمت یہ ہے کہ ان بڑے بڑے پلازوں کا چکر کاٹنے کے لیے کوئی نہیں آتا لیکن اس کالے کوٹھے کے طواف کے لیے پوری انسانیت ننگے سر اور ننگے پاؤں محوِ خرام ہے۔ کبھی کبھی تو محسوس ہوتا ہے کہ حرم کے باہر یہ بڑی بڑی بلڈنگیں، پلازے اور شاہی محلات پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اسی عظیم کوٹھے کی جانب عقیدت سے جھانک رہے ہیں اور حاضری کی اجازت چاہتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ خانۂ خدا پر پہلی نظر پڑتے ہی جو دعا کی جائے وہ سینۂ قبولیت میں ضرور ترازو ہوتی ہے۔ ہم نے بھی خدائے عزوجل سے مستقل بحران کے شکار وطن عزیز کے لیے انتہائی خضوع وخشوع کے ساتھ دعا کی۔ اپنی دعا کی نامقبولیت کا ہمیں زیادہ دکھ اس لیے نہیں ہوا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے سے پہلے ہی آگاہی تھی جسے مولانا ظفر علی خان نے یوں شعر کی صورت عطا کر رکھی ہے کہ:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

ہم وہ بدقسمت لوگ ہیں جو اسلام کے نام پر کفر اور شرک کی ترویج کیے جا رہے ہیں، جو انسان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر حیوانی سطح پر زندگی گزار رہے ہیں، جو پاکستانی ہونے کے نعرے لگاتے ہیں اور اسی ملک کی بوٹیاں نوچنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ سب سے بڑی افسوسناک بات یہ ہے کہ ہم اپنے اعمال پہ نظر ثانی کرنے یا شرمندہ ہونے کے لیے بھی تیار نہیں۔

www.urduchannel.in

مختصر یہ کہ ہم نے عقیدت اور سرشاری سے لبریز آنکھوں اور لغزیدہ قدموں کے ساتھ توحید کے اس سب سے بڑے مرکز کے سات چکر مکمل کیے۔ حجرِ اسود کو ہوائی بوسہ دیا۔ مقامِ ابراہیم پر دو نفل ادا کیے۔ آبِ زم زم سے جی بھر کے سرشار ہوئے اور پھر صفا و مروا کے سات چکر مکمل کرنے کے بعد بابِ مروا کے دائیں جانب واقع حمام کے اندر زندگی میں پہلی بار اللہ کی راہ میں سر منڈوا دیا۔ جب آئینے میں اپنے بالائی حصے پر نظر کی تو ایک بار پھر غالب بلاوجہ یاد آ گیا:

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے ''سر'' یاد آیا

❁❁❁

0000

کیا کسی کو، پھر کسی کا، امتحاں مقصود ہے؟

اس خانۂ خدا کے چاروں جانب چھوٹے بڑے پچانوے دروازے ہیں، جو سال کے تین سو پینسٹھ دن اور دن کے چوبیس گھنٹے زائرین کے لیے باہیں پھیلائے کھڑے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ چودہ سو سال سے جاری ہے اور رہتی دنیا تک جاری و ساری رہے گا۔ مسجد الحرام دنیا کی واحد مسجد ہے جہاں ایک نماز ادا کریں تو سو نماز کا ثواب عطا ہوتا ہے۔ پھر جو عبادت یہاں طواف کی صورت میسر ہے، اس کا دنیا کے کسی اور کونے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آپ مکہ میں قیام پذیر ہیں تو ہر نماز کے بعد اس روح پرور کوٹھے کے گرد سات پھیرے مکمل کیجیے اور ہر بار ایک تازہ عمرے کا ثواب اپنے کھاتے میں لکھواتے جایئے۔ طواف کا سلسلہ صرف فرض نماز باجماعت کی ادائی کے وقت موقوف ہوتا ہے۔

راہِ حق کے پروانے چوبیس گھنٹے حق کے اس سرچشمے کے گرد منڈلاتے دکھائی دیں گے۔ آپ رات کے تین بجے بھی وہاں پہنچیں تو لوگوں کی وارفتگی کا یہی عالم نظر آئے گا۔ قرآن مجید فرقانِ حمید کی سورہ آلِ عمران میں اس عبادت سے متعلق یوں ارشاد ہوتا ہے:

> ''بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہان والوں کے لیے مرکزِ ہدایت بنایا گیا تھا اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں۔ یہ ابراہیم علیہ السلام کا مقامِ عبادت ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہوا مامون ہو گیا۔ لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے اور جو کوئی اس حکم کی پیروی

www.urduchannel.in

سے انکار کرے تو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔(3 : 96-97)

اسی سورہ کی آیت نمبر 95 میں بھی واضح طور پر فرمایا گیا:

''تم کو یک سُو ہو کر ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ کی پیروی کرنی چاہیے اور ابراہیم علیہ السلام شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا''

ہمارا دین، دین ابراہیمی ہے اور ابراہیم علیہ السلام کی سب سے بڑی صفت موحد ہونا اور شرک سے بچنا ہے بلکہ دنیا میں جتنے بھی پیغمبر تشریف لائے ان کا سب سے پہلا درس لوگوں کو توحید کے بارے میں بتانا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ جو قوم بھی خدائے واحد کی پیروی سے بھٹک کر دنیاوی بتوں کی پرستش میں مشغول ہوگئی (بتوں سے مراد وہ تمام دنیاوی آسائشیں یا اشخاص ہیں جن سے ہم اپنی حاجت روائی کے لیے امیدیں باندھ لیتے ہیں یا جو ہمیں خدائے واحد کی یاد، داد اور فریاد سے غافل کر دیتے ہیں) اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف کوئی نہ کوئی پیغمبر مبعوث کیا، جس نے انھیں راہ راست پہ لانے کی بھرپور کوشش کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور سے لے کر آج تک کے بھٹکے ہوئے اور گمراہ لوگوں کا سب سے بڑا موقف یہی رہا کہ وہ بھلا اپنے باپ دادا کے عقائد اور راستے کو کیسے چھوڑ دیں؟ ایسے لوگوں کے لیے قرآن پاک میں نہایت واضح ارشادات ہیں۔ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے حوالے سے چند فرمودات ربانی یہاں درج کرتے ہیں:

سورہ اعراف کی آیت نمبر 28 میں ارشاد ہے:

''یہ لوگ جب کوئی شرم ناک کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقہ پر پایا ہے اور اللہ ہی نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ ان سے کہو اللہ بے حیائی کا حکم نہیں دیا کرتا۔'' (28:7)

سورہ البقرہ میں قادر مطلق اپنے بندوں سے یوں مخاطب ہے:

''کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جس نے ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑا کیا تھا۔ جھگڑا اس بات پر کہ ابراہیم علیہ السلام کا رب

کون ہے؟ اور اس بنا پر کہ اس شخص کو اللہ نے حکومت دے رکھی تھی۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ میرا رب وہ ہے جس کے اختیار میں زندگی اور موت ہے، تو اس نے جواب دیا، زندگی اور موت میرے اختیار میں ہے، ابراہیم علیہ السلام نے کہا:

اچھا! اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا۔ یہ سن کر وہ منکرِ حق ششدر رہ گیا، مگر اللہ ظالموں کو راہ راست نہیں دکھایا کرتا۔ (258:2)

سورہ الانبیاء میں نہایت خوبصورتی سے واضح کر دیا گیا:

''یاد کرو وہ موقع جب کہ اس نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ یہ مورتیں کیسی ہیں جن کے تم لوگ گرویدہ ہو رہے ہو؟ انھوں نے جواب دیا ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی عبادت کرتے پایا ہے۔ اس نے کہا تم بھی گمراہ ہو اور تمھارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے تھے، انھوں نے کہا: کیا تو ہمارے سامنے اپنے اصلی خیالات پیش کر رہا ہے یا مذاق کرتا ہے۔ اس نے جواب دیا: نہیں! بلکہ فی الواقع تمھارا رب وہی ہے جو زمین و آسمانوں کا رب اور ان کا پیدا کرنے والا ہے۔ اس پر میں تمھاری غیر موجودگی میں ضرور تمھارے بتوں کی خبر لوں گا۔ چنانچہ اس نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور صرف ان کے بڑے کو چھوڑ دیا تا کہ شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں۔ انھوں نے آ کر بتوں کا یہ حال دیکھا تو کہنے لگے: ہمارے خداؤں کا یہ حال کس نے کر دیا؟ بڑا ہی کوئی ظالم تھا وہ (بعض لوگ) بولے ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے سنا تھا جس کا نام ابراہیم علیہ السلام ہے۔ انھوں نے کہا تو پکڑ لاؤ اسے سب کے سامنے تا کہ لوگ دیکھ لیں (اس کی کیسے خبر لی جاتی ہے) تب انھوں نے

www.urduchannel.in

16

0000

پوچھا: کیوں ابراہیم علیہ السلام تو نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ حرکت کی ہے؟ اس نے جواب دیا: یہ سب کچھ تو ان کے اس سردار نے کیا ہے، ان ہی سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں؟ یہ سن کر وہ لوگ اپنے ضمیر کی طرف پلٹے اور (اپنے دلوں میں) کہنے لگے: واقعی ہم خود ہی ظالم ہیں مگر پھر ان کی مت پلٹ گئی اور بولے تو جانتا ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں ابراہیم علیہ السلام نے کہا پھر کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کو پوج رہے ہو جو نہ تمھیں نفع پہنچانے پر قادر ہیں نہ نقصان، تف ہے تم پر اور تمھارے ان معبودوں پر جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر پوجا کر رہے ہو۔ کیا تم کچھ بھی عقل نہیں رکھتے؟ انھوں نے کہا کہ جلا ڈالو اس کو اور حمایت کرو اپنے خداؤں کی اگر تمھیں کچھ کرنا ہے۔ ہم نے کہا: اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم علیہ السلام پر، وہ چاہتے تھے کہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ برائی کریں مگر ہم نے ان کو بری طرح ناکام کر دیا۔ اور ہم اسے اور لوط علیہ السلام کو بچا کر اس سرزمین کی طرف نکال لے گئے جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی ہیں۔'' (71-52:21)

قارئین باتمکین! آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ آتشِ نمرود سے خلاصی پانے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بھتیجے کو ہمراہ لیا اور دریائے دجلہ وفرات کے کنارے چلتے چلتے وطن مالوف (عراق) کو چھوڑ کر حاران پہنچے۔ پھر وہاں سے فلسطین کی طرف ہجرت کی اور بیت ایل، جبرون اور بیرشبع میں اپنی دعوت کے مراکز قائم کیے۔ حضرت لوط علیہ السلام کو دعوت کی تبلیغ کے لیے یہیں مامور کر کے آپ مصر سے ہوتے ہوئے حجاز مقدس پہنچے اور حکم ربی سے بیت اللہ تعمیر کیا۔ پھر اس کی خدمت حضرت اسماعیل علیہ السلام کو سونپ کر واپس جبرون کو اپنا مستقل مسکن بنایا۔ بعد میں وہیں آپ علیہ السلام کا انتقال ہوا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کفر وشرک اور غاصب وگمراہ حکمرانوں سے آلود جن حالات سے جہاد کرتے

کرتے اپنا جیون بِتا دیا۔ شاعرِ مشرق کے نزدیک ویسی ہی صورتِ حال آج بھی دنیا کے بیشتر ممالک میں اُمتِ مسلمہ کو درپیش ہے، فرماتے ہیں:

آگ ہے، اولادِ ابراہیم ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

❁❁❁

www.urduchannel.in

17

زم زم

شاعر مشرق نے اس دنیائے رنگ و بو میں، رنگ وخوں، تفرقہ بازی، دولت و ہوس، دنیاوی جاہ وحشم اور ذاتی خواہشات کے مضبوط بتوں کو دیکھ کر ایک جگہ یوں بھی ارشاد کیا تھا:

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں، لا الہ الا اللہ

خانہ خدا کے اگلوتے سنہری دروازے کی جانب والے حصے کو ''مقام ابراہیم'' کہا جاتا ہے۔ اسی جانب چند قدم کے فاصلے پر انسانی قامت سے کچھ بلند ایک فریم نصب ہے۔ اس فریم کے اندر وہ پتھر آج بھی محفوظ ہے جس کے اوپر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کی تعمیر کرتے رہے۔ پتھر کے اوپر اس معمارِ انسانیت کے قدموں کے نشانات نقش ہیں۔ پاؤں کے یہ نشانات سائز میں تقریباً آج کے انسان ہی کے برابر ہیں۔ ان نقوش سے اس بات کی بھی تردید ہو جاتی ہے کہ پرانے زمانوں میں دس دس بیس بیس گز کے انسان ہوا کرتے تھے یا یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قد دس فٹ تھا۔ پتھروں پر قدموں کے نشان ثبت ہونے سے آپ کی مشقت کا اندازہ بھی بہ خوبی ہو جاتا ہے۔ مکہ اس زمانے میں بے آب و گیا علاقہ تھا جہاں ننھے اسماعیل علیہ السلام کی خاطر پانی کی چند بوندیں ڈھونڈنے کے لیے حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو صفا سے مروہ تک کی پہاڑیوں کے درمیان دوڑ لگائی پڑی تھی۔ انداز یہ تھا کہ کبھی پانی کے کسی چشمے یا سراب کی طرف متلاشی نظروں سے دیکھتی جاتیں اور کبھی گوشہ جگر پر نظر کرتیں کہ کہیں کوئی جنگلی جانوران کو نقصان نہ پہنچا دے۔ اللہ تعالیٰ کو یہ ادا ایسی پسند آئی کہ اپنے گھر کے ہر زائر پر صفا و مروہ کی پہاڑیوں کے درمیان چلنا اور دوڑنا فرض قرار دے دیا گیا۔ رمضان المبارک اور حج کے دنوں میں ان دونوں مقامات کے درمیان انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر گامزن ہوتا ہے۔ زائرین کی سہولت کے لیے

اس راستے کو اب تین منزلہ کر دیا گیا ہے لیکن انسانی سیلاب ہے کہ امڈا چلا آتا ہے۔ والدہ محترمہ کی صحت اور عمر دیکھتے ہوئے میرا خیال تھا کہ انھیں یہ سات چکر وہیل چیئر پر لگوانا پڑیں گے جو وہاں سے پاسپورٹ یا سوریال کے عوض ہر وقت دستیاب ہوتی ہے لیکن آسمانوں میں بیٹھے اس قوی اور عزیز نے زمین پر انھیں ایسی استقامت عطا فرمائی کہ والدہ مکرمہ نے تمام تر نقاہت یا ناسازیِ طبع کے باوجود بیت اللہ کے سات چکروں کے ساتھ ساتھ صفا و مروہ کے سات چکر بھی اپنے قدموں سے چلتے ہوئے لگائے۔ اس خدائے برحق کے فضل سے بیماری جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ یہ سب کچھ میری توقع سے بڑھ کر تھا۔ وہ ایسے ہی تو نہیں فرماتا:

فبای الاء ربکما تکذبن

اس سرزمین کا سب سے بڑا اور ناقابلِ یقین معجزہ میرے خیال میں سنگلاخ ترین چٹانوں کے درمیان سے آب زم زم کا ظہور ہے۔ وہ پانی جو حضرت ہاجرہ کو بعض امکانی مقامات پر دستیاب نہ ہو سکا، وہ ننھے اسماعیل علیہ السلام کے پاؤں کی ایڑی کے اشارے سے پھوٹ بہا۔ یہ بھی باری تعالیٰ کی اپنے اس ننھے عاشق سے محبت کا اظہار تھا کہ جس نے والد کے ایک اشارے پر اپنی گردن راہ حق میں قربانی کے لیے پیش کر دی۔ اللہ تعالیٰ کی اس محبت کے وفور کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج اس خنک ولطیف وخوش تاثیر آب زم زم کی ہزاروں لاکھوں سبیلیں بیت اللہ میں لگی ہیں جن میں ٹھنڈا اور سادہ پانی ہر وقت لبالب بھرا رہتا ہے یہ دلکش سبیلیں یا کولر یا ''سقیا زم زم'' اپنے دونوں پہلوؤں میں خوبصورت کاغذی گلاسوں کی دو دو جیبیں رکھتے ہیں۔ ایک جیب سے آپ ''کاساتِ لطیف'' یعنی صاف کپ یا گلاس نکالیے اور دنیا جہان کے اس انوکھے ترین پانی سے مستفید ہونے کے بعد اسے ''کاساتِ مستعملہ'' یعنی استعمال شدہ کپ کے خانے میں ڈال دیجیے۔ گلاسوں کی اس قدر کثرت دیکھ کے ہم جیسے حاجیوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔ اس لیے ہم اگر افطاری پہ تین گلاس پانی پینے کا ارادہ رکھتے ہیں تو دس منٹ پہلے ہی تین الگ الگ گلاسوں میں پانی ڈال کے بیٹھ جائیں گے، حالانکہ حرم کے ہر کونے میں چند قدموں پر اس مصفح پانی کی سہولت کثرت سے دستیاب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف بیت الحرام میں ایک دن میں استعمال ہونے والوں گلاسوں کی کم از کم تعداد لاکھوں میں ہوگی۔ حرم سے باہر گیلنوں اور کولروں میں آب

www.urduchannel.in

زم زم بھرنے کا انتظام الگ ہے۔علاوہ ازیں ایک پورا کانوائے ہے جو مدینہ منورہ کے لیے آبِ زم زم کی فراہمی پر مامور ہے۔یہ کیسی حیران کن بات ہے کہ مکہ سے تین ساڑھے تین سو کلومیٹر کے فاصلے پر لاکھوں لوگوں کے لیے آب زم زم گاڑیوں کے ذریعے فراہم کیا جاتا ہے۔ سنتے ہیں کہ ایک دو سال قبل ان دونوں مقدس ترین شہروں کے درمیان آب زم زم کی سپلائی کی خاطر پائپ لائن بچھانے کی سعی کی گئی تھی جو کامیاب نہ ہوئی۔اللہ تعالیٰ کے اس خاص عطیے کی خاصیت یہ ہے کہ اسے پیاس کی غرض سے پیا جائے تو پینے والے کی مکمل تشفی کرتا ہے۔کھانے کے نقطہ نظر سے استعمال میں لایا جائے تو بھوک میں کمی کر دیتا ہے، پھر شفا بخشی کی طلب کو بھی بطریق احسن پورا کرتا ہے اور اگر محض برکت کے لیے بھی اس سے مستفید ہوا جائے تو مایوسی کا سامنا یہاں بھی نہیں کرنا پڑتا۔

❁❁❁

تہذیبوں کی کھچڑی

حرم کعبہ کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ یہاں مختلف تہذیبوں کی کھچڑی پکی ہوئی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھتے لیکن سب کے مقاصد اور عزائم سے آگاہ ہیں۔بعض ممالک کے لوگوں نے کسی نہ کسی علامت کے ذریعے خود کو نمایاں کیا ہوا ہے۔مثال کے طور پر ملائیشیا، انڈونیشیا اور ایران سے آنے والی لڑکیوں اور خواتین نے ایک مخصوص قسم کے سکارف سے خود کو منفرد کیا ہوا ہے۔اکثر ممالک کے لوگ لگتا ہے کسی خاص ٹریننگ، تربیت یا ہدایات کے بعد وہاں پہنچے ہوتے ہیں۔ان کی چال ڈھال، اندازِ عبادت میں اعتماد کا رنگ جھلکتا ہے۔جب کہ پاکستان سے عمرے کے لیے جانے والے زیادہ تر لوگ اناڑی اور ایجنٹوں کے ستائے ہوئے ہوتے ہیں۔ مناسب ہدایات نہ ہونے کے سبب خواتین اور بزرگوں کے اپنے اپنے قافلے سے بچھڑ جانے کے واقعات بھی عام ہیں۔ہمیں یاد ہے کہ ایک بوڑھی خاتون بدحواسی کے عالم میں خانہ کعبہ کے الٹے (Clock wise) چکر لگانے کی کوشش کر رہی تھی (عام طور پر طواف کا سلسلہ Anti Clock یعنی گھڑی کی سوئیوں کے مخالف سمت میں جاری رہتا ہے) مذکورہ خاتون کی اس جرأت رندانہ پر ایک پنجابی نے آواز لگائی۔

''مائی کھڑ پچی ایں یا طواف پئی کرنی ایں؟''

یعنی اے بزرگ خاتون آپ اس وقت گم شدگی کی حالت میں ہیں یا طواف کر رہی ہیں؟

دوسری جانب سے آواز آئی:

''ایہہ پہلے طواف دے پوں لاہن ڈی اے''

(یعنی یہ الٹا چل کے پہلے کیے جانے والے طواف کے چکر اتار رہی ہے)

www.urduchannel.in

اسی نادانی میں بعض پاکستانی خانہ کعبہ کی بجائے مقامِ ابراہیم کی طرف رُخ کر کے نوافل ادا کرنے لگ جاتے ہیں۔ یہ عادت اہل وطن کئی مقامات (بالخصوص جائے پیدائش آنحضور ﷺ اور مسجدِ نبوی میں روضۂ رسول کی جانب) زیادہ دہراتے نظر آتے ہیں۔ ایسے میں ڈیوٹی پر موجود لمبے لمبے کرتوں والے عربی شرطوں کی ''لاصلّی، لاصلّی'' (یعنی یہاں نماز نہیں ہوتی) کی صدائیں فضا میں گونجنے لگتی ہیں۔

تہذیبوں کی یہ بوقلمونی جہاں نہایت انوکھی محسوس ہوتی ہے وہاں دلچسپ اور اطمینان بخش بھی ہے۔ یہ امر ڈھارس بندھاتا ہے کہ ذات پات، تفرقہ بازی اور امیر غریب کے خانوں میں بٹی ہوئی امت مسلمہ کے گورے، کالے، پیر و جواں، مرد و زن یہاں کسی مشترکہ مقصد کے لیے جمع ہیں۔ یہ تمام لوگ اسلام کی رسی سے بندھے ہوئے ہیں بلکہ تسبیح کے دانوں کی طرح پروئے ہوئے ہیں۔ جوش ملیح آبادی نے کہا تھا:

یکساں ہے مال گو ہیں دکانیں جدا جدا
معنی ہیں سب کے ایک زبانیں جدا جدا

یہاں شلواروں قمیضوں، پتلونوں، پاجاموں، چوغوں اور احراموں کا عجیب امتزاج دیکھنے میں آتا ہے۔ وہ ممبئی کا عبدالرحیم ہو یا تہران کا ابوالخوث، خانہ کعبہ کے گرد ہانپتا سرخ و سفید اور عقیدت سے لبریز چہرے کے ساتھ اللہ اکبر کو ''اللہ اچبر'' کہتا استنبول کا سواس ہو یا کیمرون کے سیاہ حسن کا شاہکار حسن بوبا، وہ کیرالہ مالابار کا عبداللہ ہو یا انڈونیشیا کا من چلا عبدالھدیٰ، وہ کالی کٹ کا جھینپا جھینپا عبدالمجید ہو یا برقی سیڑھیوں سے خوف کھاتا ہوا تیونس کا محمد تونس، وہ رانچی کا حاجی خورشید عالم ہو یا ترکستان کا احمت کولے (Ahmet Kolay) وہ کومیلا کا مسکین آواز والا ابوالبشر ہو یا دمام کا محمد یوسف، وہ شیخوپورہ کا اقبال رندھاوا ہو یا گوجرانوالہ کا حاجی محمد صدیق، وہ انقرہ کے سرخ و سفید و توانا بوڑھے بیکر اور احمد ہوں یا مالدیپ کا مسکین بوڑھا یوسف حسن، وہ شلوار کے اوپر شرٹ پہننے والا دو تہذیبوں کا مارا ہوا نواب شاہ کا خادمِ حرم ولی داد ہو یا شاہدرہ کا ٹیکسی ڈرائیور حاجی زاہد، وہ کالے چہرے پر سفید لکیریں لگائے رکھنے والا نائیجریا کا فنافی التسبیح محمد سنوسی

ہو یا نیند میں جھونٹے لیتا ہوا ڈھاکہ کا ابوالحق، وہ تیکھے تیکھے نقوش اور بجھے بجھے خطوط والے ٹھگنے یمنی (جن کو دیکھ کے یہ واضح احساس ہوتا ہے کہ ان کی جسامت کی ساخت و پرداخت اور شخصیت کی تعمیر میں کسی ایک عنصر یا چند عناصر کی کمی رہ گئی ہے) ہوں یا لمبے اور ہٹے کٹے ترک، وہ تڑنگے مصری ہوں یا کالے سوڈانی، وہ بنے سنورے ایرانی ہوں یا ہمہ رنگ پاکستانی، وہ غصے سے بھرے عراقی ہوں یا حیرت سے نون غنہ بنے گورے، وہ حال مست حبشی ہوں یا مال مست عرب، سب کے سب اپنے خاندانی وقار، وسیع و عریض کاروبار یا دنیاوی مرتبوں کو بالائے طاق رکھ کر آئے ہوتے ہیں۔ بقول شاعر:

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے
تری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

ایسے میں جب کسی ملک کے صدر، وزیراعظم یا کسی دیگر اہلکار کو پروٹوکول کے ساتھ عمرے کی رسومات ادا کروائی جاتی ہیں تو یقین جانیں ان پر رشک کی بجائے ترس آتا ہے کہ یہ اتنے مجبور، لاچار، سہل پسند یا موت سے خوف زدہ ہو چکے ہیں کہ اللہ کے حضور بھی محتاج و مسکین بن کے پیش نہیں ہو سکتے شاعر نے ٹھیک ہی کہا تھا:

حیف ہے اس کی بادشاہی پر
تیرے کوچ کو جو گدا نہ ہوا

یہ بدقسمت لوگ شاید یہاں گزارے ہوئے لمحات کو بھی وقت کا زیاں سمجھتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ خدائے عزوجل نے ان سے بندگی اور عمومیت کا لطف چھین لیا ہے۔ یہ مانگنے کی بجائے چھیننے اور قبضہ کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ کو عام آدمی اور عاجز و درویش کس قدر پسند ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی نے لکھا ہے:

''لگتا ہے اللہ تعالیٰ کو عام آدمی بہت پسند ہے، اسی لیے تو اس نے دنیا میں سب سے زیادہ عام آدمی پیدا کیے ہیں۔''

لیکن یہ خصوصیت و اقتدار کی سولی پہ لٹکے ہوئے لوگ ہیں۔ آدمی دنیاوی اعتبار سے جتنا بڑا

0000

www.urduchannel.in

ہوتا جاتا ہے، اس کا اس بات سے ایمان اٹھتا جاتا ہے کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور یہ کہ موت خود زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔ وہ اپنے وسائل اور قوت بازو سے موت کا راستہ روکنا چاہتے ہیں، جس میں وہ بالآخر ناکام ہو جاتے ہیں۔ غالب نے موت سے اسی خوف زدگی کا حال اپنے ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے:

موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

بلکہ میرزا غالب ہی کا موقف ہے کہ ہمیں افسوس جان کے چلے جانے کا نہیں بلکہ زندگی سے انصاف نہ کر سکنے کا کرنا چاہیے، فرماتے ہیں:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یہاں مختلف ممالک سے آئے ہوئے لوگوں کے ساتھ مکالمہ زبان سے کم اور علامتوں اشاروں میں زیادہ ہوتا ہے۔ یہی اشارے کہیں خوشگوار احساسات کے اظہار کے لیے مسکراہٹ کا روپ دھار لیتے ہیں اور کہیں ناگواری کی نمائندگی کرنے کے لیے چہرے پہ ''گھوری'' کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ہر شخص یہاں مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ملک کا سفیر بھی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دو مختلف ممالک کے لوگوں کے درمیان مسکراہٹوں کا تبادلہ اصل میں دو تہذیبوں کا پُر خلوص معانقہ محسوس ہوتا ہے۔ اگر کسی کے ساتھ کوئی مکالمہ ہوتا بھی ہے تو مفہوم الفاظ کی بجائے اس کے چہرے کے تاثرات میں تلاش کرنا پڑتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ساتھ نماز تراویح ادا کرتا ہوا ملائیشیا کا ایک باشندہ کہ جس کی شکل ہو بہو مہاتیر محمد سے ملتی تھی اور جس کے پاؤں کی انگلیاں معذرت خواہانہ حد تک سکڑی ہوئی تھیں، نماز کے بعد مجھ سے پوچھنے لگا پاکستانی؟

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو بولا: مشرف؟

انداز ایسا گول مول تھا کہ میں اندازہ نہ کر سکا کہ شاباش دے رہا ہے یا الا ہمہ۔ دوسری جانب اومان کا دھواں دار منحنی سا عبداللہ تھا، جس کی پوری زندگی لگتا تھا زمین کو بوجھ سے بچانے

میں صرف ہوئی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا:

''شُغلُک؟'' یعنی کیا کام کرتے ہیں؟

کہنے لگا: ''دیفنس!!'' یعنی قوم کا فوجی محافظ ہوں۔

دیگ کا ایک ہی دانہ دیکھ کے مجھے اومان کی فوجی اور دفاعی قوت کا اندازہ ہو گیا۔ سیانے سچ ہی کہتے ہیں کہ ہر قوم ملک اور شعبے کو اپنے نمائندوں کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔

❁❁❁

www.urduchannel.in

21

خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں مَیں

ہمارے ہاں اگر کوئی شخص یا محبوب کسی سے بے رخی کا مظاہرہ کرے تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس کے پہلو میں دل نہیں پتھر ہے۔ ایسے شخص کو سنگ دل، کٹھور، کافر اور نہ جانے کن کن القاب سے پکارا جاتا ہے لیکن صحنِ حرم میں سچ مچ کا ایک پتھر خانہ کعبہ کے پہلو میں بھی موجود ہے۔ کیسا عجب معاملہ ہے کہ ہزاروں لوگ اس پتھر کو چومنے، چھونے اور سر آنکھوں پر بٹھانے کے لیے دیوانے ہوئے جا رہے ہیں۔ یہ اس نوازنے والے کی کرم نوازی ہے کہ وہ جس کو چاہے کالے رنگ کے باوجود نواز دے اور جسے چاہے تمام رنگینیوں کے باوجود دھتکار دے۔ یہ اس دنیا کی کتنی بڑی سچائی ہے:

تعز من تشاء و تذل من تشاء

یہ وہی کالا پتھر ہے جسے کعبہ کی عمارت میں نصب کرنے کا اعزاز حاصل کرنے کے لیے قریشی قبائل خون ریزی پہ تلے بیٹھے تھے اور آپ ﷺ کے دانش مندانہ فیصلے سے نہ صرف خون ریزی اور ازلی جہالت کا دریا کناروں سے پلٹ گیا تھا بلکہ اس واقعے سے آپ ﷺ کی سوجھ بوجھ، بصیرت اور دور اندیشی کی دھاک اعلان نبوت سے قبل ہی لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گئی تھی۔ یہ پتھر خانہ کعبہ کے دروازے سے چند فٹ کے فاصلے پر نصب ہے۔ اس پتھر اور دروازے کی قربت دیکھتے ہی غالب کا یہ شعر میرے ذہن پہ دستک دینے لگا:

دائم پڑا ہوا تیرے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

ناقدین اور شارحین لاکھ اس شعر میں مذکور پتھر کو محبوبِ دنیاوی کے دروازے پر پڑا ہوا پتھر لکھتے چلے جائیں، شارحین بھی اسے اُردو شاعری کے فرضی محبوب کے بیرونی دروازے کی سیڑھی

قرار دیتے رہیں لیکن میرے دل کی گواہی اس پر حجرِ اسود کی مہر ہی ثبت کرتی ہے اور کرتی رہے گی۔ خانہ کعبہ کے طواف کے دوران اس پتھر کا بوسہ لینے کو مسنون قرار دیا جاتا ہے لیکن ساتھ یہ رعایت بھی موجود ہے کہ یہ سنت یا رسم رش کی صورت میں حجرِ اسود کی طرف ہاتھ اٹھا کے، ان ہاتھوں کو چوم لینے سے بھی ادا ہو جاتی ہے۔ اس کے باوجود وہاں گھمسان کا رَن پڑتا ہے کیونکہ کھینچا تانی اور دھینگا مُشتی حضرتِ انسان بالخصوص ایشیائی انسان کی سرشت میں ''پتھلاّ'' مار کے بیٹھی ہوئی ہے، جسے سینہ بدر کرنے کے لیے اعلیٰ ظرفی اور بلند حوصلگی کی شدید ریاضت درکار ہوتی ہے۔ جب کہ یہاں ہم دیکھتے ہیں لوگ ایک دوسرے کو کہنیاں مار مار کے، دھکے دے دے کے، سروں سے پھلانگ پھلانگ کے، بوسے کے حصول میں لگے ہوتے ہیں۔ اِس پُرکشش مقام پہ سب سے زیادہ مجمع پاکستانیوں کا ہوتا ہے، جو چھینا جھپٹی اور ''کُہنی مشقی'' کے لیے دنیا بھر میں پہلے ہی مشہور ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک عربی شرطہ اس ریل پیل کو دھکم پیل میں تبدیل ہوتے دیکھ کے اپنے دوسرے ساتھی سے پوچھ رہا تھا:

''**ھذا باکستانی؟**''

اور دوسرا ساتھی پورے اعتماد سے جواب دے رہا تھا:

''**کُل باکستانی**''

سچ پوچھیں مجھے تو اپنے ہم وطنوں کی یہ دیدہ دلیری دیکھ کے سینما کی کھڑکی سے ٹکٹ حاصل کرنے والا منظر نظر آ رہا تھا۔ قطار اور انتظار ہماری مجموعی زندگی سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ہم ہر کام دھونس اور سینہ زوری سے انجام دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ کئی ایک بار تو وہاں قبضہ گروپ کا منظر بھی دکھائی دیا۔ چند ہٹے کٹے نوجوان ہاتھوں کی زنجیر بنا کے پورے مجمعے کا راستہ روک لیتے ہیں اور اپنے چند ساتھیوں، رشتہ داروں سمیت ثواب کے بُلّے لوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔

میں ایک رات باب الندوہ کی جانب والے برآمدے کی سیڑھیوں میں کعبے کی جانب منہ کیے بیٹھا ایسے ہی مناظر دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ جو خانۂ خدا کے عین سامنے بیٹھ کے ناشتے، سحریاں، افطاریاں، اور طواف کرتے ہوئے ایک دوسرے پر جھپٹ رہے ہیں، کوئی ان سے پوچھے کہ پاگلو! جس دینی و دنیاوی معجزے کے سامنے تم بیٹھے ہو، اس کے بارے میں سوچتے ہوئے

www.urduchannel.in

تو تاریخ کو پسینہ آنے لگتا ہے، یہاں تو تہذیب سرنگوں ہو کے کلام کرتی ہے، اور تم ہو کہ تمھیں یہاں کھانے پینے اور دھکے مارنے کی سوجھ رہی ہے!!!

شاید انھیں کسی نے نہیں بتایا کہ اِس گھر کے مالک کو تو عجز سب سے زیادہ پسند ہے، وہ تو ٹوٹے ہوئے دلوں میں گھر بساتا ہے، وہ تو خلقِ خدا کے لیے آسانیاں پیدا کرنے والوں پر نعمتیں لٹاتا ہے۔

پھر ہمارے لوگوں کی عقیدت کا حال بھی دنیا سے نرالا ہے۔ یہ حرمِ کعبہ، کعبہ کے غلاف اور حجرِ اسود کو ٹکریں مار مار کے ہاتھ رگڑ رگڑ کے دوسروں کے کندھوں پر سوار ہو ہو کے انھیں چومنے، چھونے، ان کے ساتھ ہاتھوں کو رگڑ رگڑ کے بدن پہ ملنے اور ثواب کی مٹھیاں بھر بھر کے جیبوں میں ڈالنے کی پڑی ہوئی ہے ان اللہ کے بندوں کو ابھی تک محبت عقیدت اور عشق کرنے کا سلیقہ بھی نہیں آیا۔ ہم سے تو وہ شاعر بہتر تھا جو اپنے دنیادار محبوب کے سامنے بھی اس قدر مؤدب ہے کہ اس کی خاک بھی محبوب سے مہذب فاصلہ رکھتی ہے:

دور بیٹھا غبارِ میر ان سے
عشق بن یہ ادب نہیں آتا

اس فلمی شاعر کی خواہش میں بھی عقیدت اور احترام جھلکتا ہے جو لکھتا ہے کہ:

تم سامنے بیٹھے رہو پلکیں میری جم جائیں
حسرت ہے کہ یہ گھڑیاں، جب آئیں تو تھم جائیں

کاش ہم اللہ اور اس کے پیارے رسول ﷺ سے اندھی بہری عقیدت رکھنے کے بجائے عشق و عقیدت کے آداب سے واقف ہو جائیں۔ حکیم الامت بال جبریل میں رقم طراز ہیں:

جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی
کُھلتے ہیں غلاموں پہ اَسرارِ شہنشاہی
عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا ہے، بے آہِ سحر گاہی
اے طائرِ لاہوتی! اُس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو، پرواز میں کوتاہی

میں وہیں بیٹھا سوچتا رہا کہ کیا عبادت صرف نماز، روزے، زکوٰۃ، حج، طواف، نوافل اور پتھر کا بوسہ لینے جیسے ظاہری اعمال ہی کا نام ہے؟ جسے ہم انگریزی محاورے کے مطابق By hook or by crook حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کیا عاجزی، انکسار، درگزر، اپنی باری بھی دوسروں کے لیے چھوڑ دینا، بزرگوں کو ہاتھ تھام کے وضو کروانا، سڑک پار کروانا یا بھٹکنے کی صورت میں انھیں ہوٹل کا رستہ دکھانا، دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرنا، ایثار اور عفو سے کام لینا، اپنے نفس کو مارنا، خواہشات کو گھٹا لینا، مذکورہ بالا عبادات سے بڑی عبادات نہیں ہیں؟ کیا اپنی ذات سے باہر نکل کے دوسروں کے حقوق کو سمجھنا اصل انسانیت نہیں ہے؟ دل کو اسی قسم کے خیالات کے جمِ غفیر نے گھیرا ہوا تھا کہ حکیم الامت کی اسی غزل نے امید کی کرن دکھائی اور اب کے یہ شعر سامنے آن کھڑا ہوا:

نومید نہ ہو ان سے اے رہبرِ فرزانہ!!
کم کوش تو ہیں لیکن، بے ذوق نہیں راہی

❁❁❁

0000

www.urduchannel.in

23

خوگرِ پیکرِ محسوس ''ہے'' انساں کی نظر

حجرِ اسود کی بوسہ کشی کے دوسرے بڑے حریف حبشی ہیں جو اکثر و بیشتر اس سلسلے میں پاکستانیوں سے پنجہ آزمائی کرتے پائے جاتے ہیں۔ہم ایشیائی باشندوں کا کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے کہ منہ زبانی اظہار و اقرار سے ہماری تشفی نہیں ہوتی۔ ہم عقیدت اور عقیدے میں بھی جھولیاں بھرنے میں لگے رہتے ہیں۔ ہماری معیار کے بجائے مقدار پہ نظر ہوتی ہے۔کسی چیز کے لمس سے جی بھر کے متمتع ہوئے بغیر ہم ازلی بھوکوں کا کلیجہ ہی ٹھنڈا نہیں ہوتا۔مفکر پاکستان نے بجا فرمایا تھا کہ:

خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیوں کر

ویسے آپس کی بات ہے یہ اپنے شاعرِ مشرق بھی عجیب وغریب کیفیات کے حامل شاعر ہیں۔وہ اپنے کلام کے ذریعے قارئین کو انوکھے نرالے نتائج اور حقائق سے روشناس کراتا ہے لیکن ایک بات ہے کہ تھا وہ خود بھی ایشیائی۔زبانی اظہار عقیدت سے اس کی بھی تسلی نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایک مقام پہ وہ خود بھی فریاد کناں ہے کہ:

کبھی اے حقیقتِ منتظَر! نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

اس کی دلیل اور جواز وہ یہ ڈھونڈ کے لاتے ہیں:

طرب آشنائے خروش ہو،تُو نوا ہے،محرمِ گوش ہو
وہ سرود کیا کہ چھپا ہوا ہو،سکوتِ پردۂ ساز میں

حرم کے اندر رات کا منظر روح پہ وجد طاری کر دیتا ہے۔لگتا ہے مسجدِ حرام کے نو کے نو مینار،

نَو بہ نَو انداز میں اِس کالے کوٹھے کی عظمت کے حضور اپنی اپنی گردنیں آسمان کی جانب اٹھائے مبہوت کھڑے ہیں۔ برقی قمقموں کی محویت کا یہ عالم کہ آنکھ تک جھپکنا بھول گئے ہیں۔اوپر سے چاند لگتا ہے کہ آسمان کی سیڑھی لگائے اس ہستی کے حضور اپنے ٹھنڈے مستعار حسن کا دیا جلانے آیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خانۂ خدا کے سرمگیں حسن کے سامنے چاند کا چراغ جلتا نظر نہیں آتا۔یوں لگتا ہے کہ اللہ کے اس گھر سے دوری کی بنا پر وہ ازل سے گھٹ گھٹ جاتا ہے۔

میں نے حجازِ مقدس پہ جانے سے پیشتر بعض معلومات اور آتشِ شوق بڑھانے کی خاطر اپنے ایک دیرینہ اور پڑھے لکھے دوست کا عمرے کا سفرنامہ خرید کے پڑھا تھا۔ظالم نے بعض بڑی خوبصورت باتیں کی ہیں،زبردست جملے لکھے ہیں،شعرا کے خوبصورت اشعار درج کیے ہیں لیکن عقیدت کے بیان میں وہ بھی اپنے روایتی اسلوب کے کلف دار ملبوس سے باہر نہیں نکل سکا۔وہ وہاں بھی حرمین شریفین کی بجائے ڈکشنری کے حضور سربسجود نظر آیا۔پھر اس کا اللہ سبحانہ تعالیٰ کو ''اللہ صاحب'' لکھنا مجھے آج تک ہضم نہیں ہو سکا۔وہ غالباً اس سے اللہ تعالیٰ کی توقیر بڑھانا چاہتا تھا۔اس نے کہیں مولوی عبدالحق کی لغت میں پڑھ لیا تھا کہ ہر زندہ ہستی کو صاحب لکھا جا سکتا ہے،تو اس نے بھی آنکھیں بند کر کے جڑ دیا۔ مجھے تو یہ بالکل ایسے لگتا ہے: جیسے پرنسپل صاحب،ڈی سی او صاحب،ناظم صاحب،تھانے دار صاحب،پٹواری صاحب حتیٰ کہ شیخ صاحب۔ہت تیرے کی.....!!!

حرمِ پاک کے اندر سعودی حکومت کے حسنِ انتظام کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔حرمِ پاک میں قدم قدم پر ٹھنڈے اور سادہ آب زم زم کی سبیلیں تو ہیں ہی،اِس کے ساتھ ساتھ دنیا کی ہر زبان کے ترجمے کے ساتھ اور بلا ترجمہ خوبصورت ریکوں میں قرآن پاک کے نئے نکور نسخے بھی ہر جگہ دستیاب ہیں۔ ہزاروں،لاکھوں لوگوں کے مجمعے کو کسی لمحے بھی ان دونوں چیزوں کی عدم دستیابی کی شکایت نہ پیدا ہونے دینا انتظامی معجزہ نہیں تو کیا ہے؟ حوائجِ ضروریہ کے لیے بھی حجاجِ کرام اور زائرین کے لیے بڑا وسیع انتظام ہے۔غسل خانوں میں معتدل مزاج پانی کا نہایت معقول بندوبست ہے۔

یہ پانی جدہ کے قریب سمندر سے پائپ لائن کے ذریعے فراہم کیا گیا ہے۔حرم کے بالکل

www.urduchannel.in

قریب والے گسل خانوں پہ نماز کے قریب رش بڑھ جاتا ہے جس سے بچنے کے لیے باب عبدالعزیز کی جانب زیرِ زمین (برقی سیڑھیوں کی سہولت کے ساتھ) اور بابِ مروہ کی طرف دو منزلہ غسل خانوں کا وسیع و عریض بندوبست کر دیا گیا ہے۔ بابِ مروہ والے غسل خانے عین اسی جگہ تعمیر کیے گئے ہیں جہاں کسی زمانے میں ابوجہل کا گھر ہوا کرتا تھا۔ زمینی حوالے سے اگر دیکھا جائے تو ابوجہل کا گھر آنحضور ﷺ کے گھر کی نسبت حرم سے زیادہ قریب ہے۔ اس سے یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ ایمان اور شعور کی دولت مسجدوں، مندروں یا عبادت گاہوں سے جسمانی ہمسائیگی کی بنا پر نہیں بلکہ قلبی قربت کے بل بوتے پر عطا ہوتی ہے۔

پہلے پہل باتھ روموں کے لیے وہاں ''حمام'' کا لفظ استعمال ہوا کرتا تھا۔ اب جانے ان کے جی میں کیا آئی کہ یہی مقامات ایک دم ''دوراتِ میاہ'' بن گئے ہیں۔ پھر ان کے ساتھ ''الرجال'' اور ''النسا'' کی پخ بھی لگ چکی ہے۔ حرم کے اندر جتنے سائن بورڈز آویزاں ہیں، ان کے اوپر چار زبانوں میں ہدایات درج ہیں۔ عربی، فارسی، انگریزی اور اردو، دنیا بھر سے شاید ہی کوئی مسلم باشندہ ایسا ہو جو ان زبانوں کی مدد سے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر ہو۔

رمضان المبارک میں اس شہرِ توحید کی ایک خاص بات مقامی لوگوں کی مہمان نوازی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ سال بھر کے دوران ان لوگوں نے جو کچھ کمایا تھا، وہ سب کچھ بلکہ اس سے بھی زیادہ، رمضان کی برکات سمیٹنے کے لیے مہمانوں پر لٹانے کا عزم لے کر آئے ہیں۔ مقامی لوگ عصر کی نماز کے بعد گاڑیوں اور ملازموں کو ساتھ لے کے نکلتے ہیں۔ گھروں اور بازاروں سے جھولیاں، تھیلے اور ٹوکریاں بھر بھر کے رنگا رنگ کھجوریں اور دیگر لوازمات سمیت افطاری سے کچھ دیر قبل حرم پاک پہنچ جاتے ہیں، جہاں پہلے دسترخوان اور پھر دیدہ و دل بچھائے جاتے ہیں۔ آتے جاتے حاجیوں اور زائرین کو پکڑ پکڑ کے اور خوشامدیں کر کر کے بٹھایا جاتا ہے۔ پلاسٹک کی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں کھجوریں اور دیگر فواکہات پیش کیے جاتے ہیں۔ دعوت قبول کر لینے والے مہمانوں کے سر پر ممنونیت کا تاج رکھا جاتا ہے۔ بلکہ بعض میزبان تو گھر سے گہوہ (قہوہ) اور شائے (چائے) کے تھرماس بھر کے لائے ہوتے ہیں جو مغرب کی نماز کے بعد چینی کپوں یا کاغذی گلاسوں میں مہمانوں کو پیش کی جاتی ہے۔

افطاری اور نمازِ مغرب کے درمیان دس پندرہ منٹ کا وقفہ ہوتا ہے۔ افطاری مکمل ہوتے ہی ملازمین کی ایک فوجِ ظفر موج زمینِ حرم پر برسرِ پیکار دکھائی دینے لگتی ہے اور چند منٹوں میں حرم کے اندرونی و بیرونی فرش کی شاندار دھلائی اور صفائی پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ اس عرصے میں وائپر بردار حضرات اپنی مہارت اور پھرتی کے وہی کمالات دکھاتے ہیں جو کبھی نیزہ بازی اور گتکے کے فنون میں دکھائی دیا کرتے تھے۔ صفائی کرنے والے عملے میں زیادہ تعداد بنگالیوں کی ہے، علاوہ ازیں پاکستانی اور انڈین ملازمین بھی خاصی تعداد میں ہیں لیکن مجال ہے جو کسی کام میں اپنی روایتی یا وطنی سستی کا مظاہرہ کیا ہو۔ سچ کہا تھا حضرت اقبال نے کہ:

واں ایک کے تین تین بن جاتے ہیں

❁❁❁

0000

www.urduchannel.in

25

سوئے حرم لے چل

مکہ کی سرزمین پر ہم نے 31 اکتوبر کی گہری ہوتی شام میں قدم رکھا تھا۔مختصر سا اسباب الزورا ہوٹل کی دیواروں میں مقید کر کے پہر گئے رات بیت اللہ کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ بقیہ رات نماز ونوافل اور عمرہ کی ادائیگی میں بسر ہوئی۔ جب سر منڈانے اور غسل کرنے کے بعد دنیاوی لباس میں واپس آئے تھے اس وقت سحری کھانے کا وقت ہو رہا تھا۔ چنانچہ ہوٹل سے کھانا منگوا کے حرم کے بیرونی صحن میں باب الفتح کے قریب سیری کے ساتھ سحری کی۔ کھانے کے بعد عربی قہوے کو دودھ پتی میں تبدیل کروا کے اس سے جی بھر کے فیض یاب ہوئے۔ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد ہوٹل کو سدھارے اور خوابوں کی اس سرزمین میں پہلی بار محوِ خواب ہوئے۔

حجازِ مقدس میں دن کے وقت سونا مقامی ماحول کے بھی عین مطابق تھا کیونکہ رمضان المبارک میں وہاں کے تمام دفاتر اور ادارے عشاء سے فجر تک کھلتے ہیں۔ وہاں اس مہینے میں صحیح معنوں میں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ لوگوں نے دن رات کو تین حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یعنی عشاء سے فجر تک کام، فجر سے ظہر تک آرام اور ظہر سے عشاء تک عبادات ومناجات وغیرہ۔ ہمارے ہوٹل کی گاڑیاں بھی پانچوں نمازوں کے لیے مہمانوں کو لانے لے جانے کے لیے مستعد تھیں۔ ہم فجر کی نماز ادا کر کے واپس ہوٹل چلے آتے اور ظہر کے وقت حرم جا کے عشاء تک قیام کرتے۔ کبھی کبھی فجر سے عشاء تک ہی صلوٰۃ وطواف وتلاوت میں یا مکہ کے گلیاں بازار اور دیگر مقامات دیکھنے میں مصروف رہتے۔

مکہ کی دکانیں اور مارکیٹیں کھانے پینے والی اعلیٰ ترین اشیا سے مونھوں منہ بھری رہتی ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ تقریباً ہر ضروری چیز ایک روپے (ریال) میں دستیاب ہے۔ ہر طرح کا میٹھا نرم پانی (Soft drink) ٹین کے ڈِبے (Tin pack) میں دستیاب ہے۔ شیشے کی عام

بوتلیں (Loose packing) کہیں دکھائی نہیں دی۔ پھلوں کے تازہ رس (Fresh juices) کے لیے صاف ستھری مشینیں لگی ہوئی ہیں۔ دودھ اور لسی وغیرہ بھی یہاں کاغذی پیرہن اوڑھے ہوئے ہیں۔ مرغیوں کو بے بال و پری کی حالت میں مومی جامہ (Pollythin) اوڑھا کے فریزروں کی زینت بنایا گیا ہے۔ دنیا کی بہترین سبزیاں اور پھل تازہ ترین حالت میں گاہکوں کے منتظر ہیں۔

ہوٹلوں میں مزے دار پاکستانی کھانے ہر وقت موجود ہیں۔ ہوٹل میں جگ یا گلاس میں کھلا پانی پیش کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ چھوٹی بڑی صاف پانی (Mineral water) کی بند بوتلیں ایک اور آدھے ریال میں دستیاب ہیں۔ بہت سے حاجی آبِ زم زم کی بوتل ساتھ لے کے آتے ہیں اور ثواب اور سواد کی آمیزش سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ منفرد بات یہ ہے کہ سعودیہ میں پیپسی کی (Tin pack) بوتل 1959ء میں بھی ایک ریال کی تھی اور آج بھی اسی قیمت پر میسر وموجود ہے۔ مختصر یہ کہ اگر پاکستان سے جانے والوں کو سولہ کا پہاڑا (یاد رہے کہ اس وقت ایک سعودی ریال پاکستانی 16 روپے کے برابر تھا) یاد نہ ہو تو سعودی عرب کھانے پینے کے اعتبار سے بھی انتہائی سستا اور مزے دار ترین ملک ہے۔

فٹ پاتھوں پہ سوڈانی عورتیں چینی اشیا کی تجارت میں دھڑا دھڑ مصروف ہیں۔ چینی مصنوعات کا ہر جگہ غلبہ ہے۔ آبِ زم زم اور کھجور کے علاوہ ہر چیز باہر کی ہے حتیٰ کہ وہاں تو خریدار بھی سارے کے سارے امپورٹڈ ہوتے ہیں۔ کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ سعودی کھجور تو سیزن کے آغاز ہی میں ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد کھجور بھی درآمدی ہوتی ہے۔ آبِ زم زم کو البتہ مقامیت کا شرف رہتی دنیا تک حاصل رہے گا۔ وما توفیقی الا باللہ۔

جہاں تک حرم کی تعمیر وتزئین کا سلسلہ ہے یہاں کے انتظام وانصرام کی ذمہ داری سال ہا سال تک ترکوں کے پاس رہی لیکن انھوں نے اس کے گرد ایک برآمدہ تعمیر کرنے کے علاوہ کوئی تعمیری کارنامہ نہیں دکھایا۔ یہ برآمدہ ترکوں کی نشانی یا کسی معاہدے کے تحت آج تک قائم ہے۔ یہ بات بھی 2003 کی ہے۔ اب سنا ہے حاجیوں اور زائرین کی روز افزوں آمد کے پیشِ نظر حرم کو چاروں جانب حدِ امکان تک وسعت عطا کر دی گئی ہے۔ البتہ اسی برآمدے کے پیچھے سعودی

www.urduchannel.in

حکومت اور بالخصوص شاہ فہد کی حکومت میں جدید طرز تعمیر کے شاہکار وجود میں آ چکے ہیں۔ ان عمارات کے شیشے جیسے فرش اور دیدہ زیب در و دیوار خادمین حرمین شریفین کی عقیدت اور فراخ دلی کے عکاس ہیں۔ سابقہ سعودی فرماں روا کی ربِ کعبہ سے محبت کا ایک انداز یہ بھی ہے کہ بابِ صفا کی جانب، حرم کے بیرونی صحن کے ساتھ، شاہی محل بھی کھڑا کر لیا گیا ہے جسے دیکھ کے خانۂ خدا کی قربت کے ساتھ ساتھ کبھی کبھی ساحر لدھیانوی کا یہ شعر بھی ذہن کے دریچے پر دستک دینے لگتا ہے:

ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق

یہاں اس امن والے شہر کی ٹریفک کا تذکرہ کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جس کے خمیر میں نفاست، نرمی اور برداشت کا گاڑھا شیرہ گوندھ دیا گیا ہے۔ حرم کے چاروں جانب رنگ برنگی گاڑیوں کا دن رات تانتا بندھا رہتا ہے۔ سڑکوں کی حالت بھی قابل رشک ہے۔ اس کے باوجود گاڑیاں ہیں کہ پھونک پھونک کر قدم رکھتی ہیں۔ آپ جس مقام پر چاہیں سڑک عبور کیجیے یا سڑک کے اوپر چلنا شروع کر دیجیے۔ مجال ہے جو کہیں سے بریکوں کے چیخنے یا ہارنوں کے چلّانے کی آواز سنائی دے جائے۔ وہاں یہ منظر دیکھ دیکھ کر کئی بار دل سے دعا نکلتی ہے کہ کاش اس طرح کا سلیقہ کوئی ہماری ٹریفک کو بھی سکھا جائے۔ ہمارے ہاں تو ہر طرح کی ٹریفک کا یہ حال ہے کہ اس کے لیے ٹریفک کی بجائے ٹیریفک (Terrific) کا لفظ زیادہ موزوں ہے۔

بھیک مانگنے پر وہاں مکمل طور پر پابندی ہے۔ اس کے باوجود بعض لوگ مواقع پیدا کر لیتے ہیں۔ ان موقع شناسوں میں سوڈانی عورتیں اور پاکستانی مرد پیش پیش ہیں۔ سوڈانی عورتیں کبوتروں کا دانہ فروخت کرنے کے بہانے اور پاکستانی مرد جیب کٹ جانے کا عذر تراش کر۔

ایک دن ابوجہل والے غسل خانوں کی طرف گزر ہوا تو ایک عجیب و غریب منظر دیکھنے میں آیا۔ وہاں ایسے جوانوں اور نوجوانوں کی قطار لگی ہوئی تھی جن میں سے کسی کا بازو کٹا ہوا ہے اور کسی کی ٹانگ۔ ان میں زیادہ تر سیاہ فام لوگ تھے اور اپنے تراشیدہ اعضا کی نمائش کر کے نہایت رقت انگیز انداز میں بھیک طلب کر رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد واپسی ہوئی تو وہاں چند عربی

0000

شرطے کھڑے تھے اور تمام کٹے پھٹے بھکاری مختلف سمتوں میں حسب استطاعت تیزی کے ساتھ دوڑ لگانے کا مقامی مقابلہ جیتنے کی ہر ممکن کوشش میں لگے تھے۔ ایک آزمودہ کار حاجی صاحب نے بتایا کہ یہ تمام بھکاری سزا یافتہ مجرم ہیں جو چوری، سینہ زوری اور اس سے ملتے جلتے جرائم میں اعضا تراشی کی سزا بھگت چکے ہیں اور اب بھی محنت مزدوری کی بجائے اسی طرح کی حیلہ جوئیوں میں مصروف رہتے ہیں۔

اس سرزمین مقدس کا ایک حیران کن پہلو یہ بھی ہے کہ اگر زمینی حوالے سے دیکھا جائے تو مکہ کی سب سے نشیبی جگہ بیت اللہ ہے جس کے گرد پانچ سات فٹ اونچا برآمدہ ہے اتنی ہی اونچی نئی عمارت ہے مزید پانچ چھ فٹ بلندی پر بیرونی صحن ہے اور پھر اس سے بھی بلند بیرونی سڑک ہے۔ اس عمارت کے تمام تر ظاہری نشیب کے باوجود باطنی طور پر اسے وہ فراز نصیب ہوا ہے کہ جسے ماپنے کے لیے دنیا کے تمام پیمانے ناکافی ہیں حتیٰ کہ انسانی ذہن اور محسوسات کا پیمانہ بھی عاجز و درماندہ۔

❁❁❁

www.urduchannel.in

27

من ترا حاجی بگویم

جس روز ہم نے آستانہ اولیٰ پہ پہلی حاضری دی تھی، اس وقت مکہ کا درجہ حرارت 32 ڈگری تھا۔ اس شہر میں سارا سال کم وبیش اسی طرح کا موسم رہتا ہے۔ اس صورت حال میں بھی بھرپور مصلحت پوشیدہ ہے۔ یہاں پورا سال دنیا بھر کے لوگوں کی آمدورفت جاری رہتی ہے۔ اگر یہاں پہ برفیلا اور یخ بستہ موسم ہوتا تو حجاج وزائرین کو بھاری گرم کپڑوں اور بستروں کا بوجھ اٹھا کے آنا پڑتا۔ سخت ترین جاڑا عبادت کے ہر مرحلے میں حارج رہتا۔ وضو اور غسل کے معاملات ایک مشقت کی طرح بھگتنے پڑتے۔ شدید بارشوں یا برف باری کی بنا پر آمدورفت یا عبادات کا سلسلہ کئی کئی ہفتے معطل رہتا۔ ننگے پاؤں طواف اور احرام کی دو چادروں میں گزر بسر کرنے والوں پہ کپکپی طاری رہتی۔ ٹھنڈے موسم میں آبِ زم زم کو دو اسمجھ کے حلق سے نیچے اتارا جاتا۔

لیکن صاحب! قدرت بھی انسان کی کس کس طرح سے معاونت اور دست گیری کرتی ہے۔ توحید کے اس سب سے بڑے مرکز کو ایسا موسم اور آب وہوا عطا کر دیے گئے ہیں کہ عبادات اور قیام وخرام کے تمام مراحل ہنستے کھیلتے طے ہو جاتے ہیں۔ لوگ دنیا بھر سے ہلکے پھلکے سامان کے ساتھ یہاں آتے ہیں اور نہایت سبک سری کے ساتھ تمام فرائض سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ بلکہ بے شمار ایسے لوگ بھی مشاہدے میں آئے جو اپنے گھر سے ہی احرام باندھ کے نکلتے ہیں۔ اسی لباس میں یہاں چند روز قیام کرتے ہیں اور پھر اسی نیم کفن پوشی کی حالت میں اپنے اپنے گھروں کو سدھار جاتے ہیں۔

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کپڑوں کا ایک جوڑا لے کے گھر سے چلتے ہیں اور بوقت ضرورت اسے دھو کر غسل خانوں میں اسی غرض سے لگے بڑے بڑے پنکھوں پر سکھا کے دوبارہ زیب تن کر لیتے ہیں۔ جوتوں کی تو وہاں ایک چپل کے سوا شاید ہی کہیں ضرورت محسوس ہوتی ہو۔

پھر اپنے چپل یا سلیپروں کو وہاں مسلسل سنبھال کے رکھنا تقریباً ناممکنات میں سے ہے۔ اس مشکل کا بہت سے زائرین نے یہی آسان حل نکالا ہے کہ آپ اپنے حصے کا ایک جوڑا سلیپر حرم کے باہر کسی غریب اور کم نصیب ملک کے عوام کی طرح بے ترتیب اور بے یارومددگار پڑے ہوئے سلیپروں کے ہجوم میں داخل کر دیجیے اور پھر اپنی مرضی سے کسی بھی دستیاب جوتے کی مدد سے وضو اور غسل کے معاملات ادا کر لیجیے۔

موسم اور مسافت کی اس گرما گرمی کے باوجود سعودی حکومت کے حسن انتظام کی داد دینا پڑتی ہے کہ جس طرح انھوں نے ہر مزاج، ثقافت اور زبان سے تعلق رکھنے والوں کے پینے کے لیے ٹھنڈے گرم آب زم زم اور قرآن پاک کے متنوع تراجم والے نسخوں کا بندوبست کیا ہے، بالکل اسی طرح حرم کے جدید تعمیر شدہ برآمدہ نما کمروں کے اندر جدید ترین برقی آسائشات کے ذریعے ہر خطے اور علاقے کے لوگوں کے لیے من پسند ماحول پیدا کر رکھا ہے۔ منتظمین نے اس سے بھی بڑھ کے یہ کیا ہے کہ دنیا کے یخ بستہ جزیروں میں گلیشیروں میں پوشیدہ سنگ مرمر تلاش اور درآمد کر کے اس سے اندرونی حرم کا صحن تیار کر دیا ہے۔ اس سنگ مرمر کا کمال یہ ہے کہ فضا کا درجہ حرارت 50 ڈگری بھی کیوں نہ ہو اور موسم گرما کا سورج گھنٹوں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑا رہے، اس کے مزاج اور بدن میں گرمی کی ایک لہر بھی ابھارنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج طواف کرتے ہوئے ایک طرف بیت اللہ کا تقدس اور تصور قلب و ذہن کو طراوت بخشتا ہے تو دوسری جانب سنگ مرمر کا خوشگوار لمس پاؤں زمین پر نہیں پڑنے دیتا۔

موسم کی گرم جوشی کا سلسلہ پوری استقامت کے ساتھ جاری تھا کہ دس نومبر بروز سوموار طائف کی جانب سے گھٹا اٹھ کے آئی اور پورے حرم کے اوپر سایہ فگن ہو گئی۔ کالی کالی بدلیوں کو چلتے دیکھ کے محسوس ہوتا تھا کہ یہ سرمگیں احرام اوڑھ کے بیت اللہ کا طواف کرنے آئی ہیں۔ ظہر سے پہلے آندھی نما تیز ہوا بھی چلی تھی اور نہ صرف یہ کہ حرم اور مکہ شہر میں پہلی بارمٹی گھٹے کا کسی حد تک وجود نظر آیا تھا بلکہ اس مقدس اور پُرتر مقام پر گردوغبار کی موجودگی، گستاخی اور بے ادبی کے زمرے میں داخل ہوتی دکھائی دیتی تھی کیونکہ یہاں ایک طرف تو ہمارا اُردو غزل کا امام اپنے دنیادار محبوب کے حضور اس قدر مودب ہے کہ وحشت کے عالم میں بھی آداب واحترام کو فراموش نہیں کرتا:

www.urduchannel.in

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی
کوسوں اس کی اور گئے اور سجدہ ہر ہر گام کیا

اور دوسری جانب کائنات کے سب سے محترم اور حقیقی محبوب کے شہر اور خانۂ خدا میں ہوا کے جھونکے کی یہ سرکشی آنکھوں کو بھلی محسوس نہیں ہوئی۔ چنانچہ تھوڑی ہی دیر بعد جھونکوں کی خودسری کے ازالے کے لیے یا گردوغبار کی سرزنش کی خاطر گھٹائیں چاروں طرف سے آن موجود ہوئیں، جنھوں نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے ماحول کو اپنی باہوں میں لے لیا اور پھر غیظ وغضب کے ساتھ گردوغبار پر برس پڑیں، جس کے نتیجے میں سر اور آنکھوں میں پڑنے والی خاک گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوگئی۔ بقول شاعر:

جو منھ کو آ رہی تھی، وہ لپٹی ہے پاؤں سے
بارش کے بعد خاک کی سیرت بدل گئی

بارش کافی دیر تک حرم پاک کے فرش پر اپنا سر پٹکتی رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی پھوار برآمدے میں بیٹھے اللہ میاں کے مہمانوں کے ساتھ معذرت خواہانہ سرگوشیوں میں مصروف رہی۔ موسم کا مزاج درست کرنے کی شرط پر اسے رخصتی کی اجازت مل گئی۔ برسات کی جل تھل تو اس علاقے کا کبھی کبھار ہی رُخ کرتی ہے البتہ عقیدتوں کا سیلاب زائرین کی آنکھوں اور دلوں کی دیواروں کو دن رات نم کرتا رہتا ہے۔

جہاں تک اندازِ تخاطب کی بات ہے، یہاں ہر زائر دوسرے کو حاجی کہنے پر تلا ہوا ہے۔ خاص طور پر عربی شرطے تو ہر مہمان کو اسی لقب سے مخاطب کرتے ہیں۔ اس کے لیے تو انھیں جواباً مُلّا کہنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی۔ بھلے ہم اس مقدس زبان کے جملہ مفاہیم سے آگاہ نہیں ہیں لیکن یہ عربی سپاہی اسی ایک لفظ کی ادائیگی اور لہجے کے اتار چڑھاؤ سے مخاطب پر اپنا مکمل عندیہ ظاہر کر دیتے ہیں۔ کسی مہمان کو تو وہ اتنی لطافت اور نرمی کے ساتھ ''حاجی'' کہیں گے کہ وہ اس کے لیے رحمت کی دعا کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ کہیں اس لفظ میں سوالیہ لہجہ شامل کر کے حاجی سے اس کا مسئلہ پوچھتے دکھائی اور سنائی دیتے ہیں اور کبھی کبھی غلط جگہوں پر سجدے کرنے، قانون کی خلاف ورزی کرنے یا شرک جیسے فعل کا مرتکب ہونے والے کم فہم لوگوں کی طرف وہ اتنی درشتی سے

''حاجی!!!'' کا تُرپ پتّا پھینکتے ہیں، جیسے کہہ رہے ہوں! ''حاجی تیرا کچھ نہ رہوے'' ہمارے اُردو کے ایک شاعرِ دل پذیر نے سچ کہا تھا:

سیف اندازِ بیاں بات بدل دیتا ہے
ورنہ دنیا میں کوئی بات، نئی بات نہیں

❁❁❁

www.urduchannel.in

فرقہ فرقہ کردی نی.....

پانچ نومبر کو ایجنٹ کی طرف سے دی گئی ہوٹل کی سہولت ختم ہو جانے پر ہم نے ہوٹل ''الزوراء'' کو خیرباد کہہ دیا اور اپنے ایک عزیز کے اصرار پر کچھ دن کے لیے مکہ کے پوش ایریا میں واقع، اُس کے گھر میں قیام پذیر ہو گئے لیکن یہ قیام بھی ''کہیں پہ نگاہیں، کہیں پہ نشانہ'' والا تھا کیونکہ ہمارے یہ منافع بخش دن اور روح پرور راتوں کا بیشتر حصہ حرمِ پاک میں بسر ہوتا تھا۔ رمضان المبارک کا مہینہ جیسے جیسے آگے سرک رہا تھا، حرم کی رونقیں دوبالا ہوتی جارہی تھیں۔ مختلف تہذیبوں کے لوگوں کی عادات کے ساتھ ساتھ ان کی عبادات کا مشاہدہ بھی میری دلچسپیوں میں شامل تھا۔

حقیقت تو یوں ہے کہ وطنِ عزیز میں دین کی جو مخدوش صورتِ حال ہے، وہ تفرقہ بازوں اور فرقہ پرستوں کے لیے تو مثالی ہے اور ''لا تفرقو'' کے شفاف راستے پہ چلنے والوں کے لیے نہایت تکلیف دہ ہے۔ نہ جانے ہم اس حقیقت کو کیوں فراموش کر دیتے ہیں کہ روزِ قیامت ربِ رحیم ہم سے یہ نہیں پوچھے گا کہ ہم شیعہ ہیں یا سُنّی؟ لیکن وہاں اِس بابت سوال ضرور ہوگا کہ تمھارا ہمسایہ تم سے خوش تھا یا ناخوش؟ وہ کہیں رات کو بھوکا تو نہیں سویا تھا؟ اپنے اس بدنصیب ملک میں یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ آپ شیعہ، سنی، وہابی، بریلوی، دیوبندی، حنفی، شافعی، مالکی تعارف کے ساتھ تو آسانی سے معروف ہو سکتے ہیں لیکن بطور مسلم اپنی پہچان یا شناخت برقرار رکھنا دشوار تر ہے۔ شاعر مشرق نے اسی گھمبیر صورت حال کے پیشِ نظر ہی ارشاد کیا تھا کہ:

فرقہ بندی ہے کہیں، اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں!!

شاعرِ مشرق کی شاعری اور خطوط کے متون شاہد ہیں کہ اُن کا اُمتِ مسلمہ میں شدت سے در آئی فرقہ آرائی، پیر پرستی اور عیار لوگوں کی ذہنی غلامی پر جی بہت کڑھتا تھا۔ چنانچہ وہ ایک اور موقع

پر ہلالِ عید سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر
اپنی آزادی بھی دیکھ، ان کی گرفتاری بھی دیکھ

بہت سے لوگ تو فرقہ بازی کے اس کھیل میں بھی کاروباری مفاد، زمانہ سازی، منافقانہ دل نوازی، ہر طرح کے لوگوں سے دل داری اور مطلب برآری کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوئے ملتے ہیں، بقول اکبرالٰہ آبادی:

میرا طریق مذہب کیا پوچھتی ہو منی
شیعوں کے ساتھ شیعہ، سنی کے ساتھ سنی

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا قرآن اور دین عربی زبان کی وساطت سے ہم تک پہنچا ہے۔ تو ظاہر ہے عربی زبان وثقافت سے کما حقہ، آشنائی اور شناسائی رکھنے والے لوگ اس کے اغراض ومقاصد اور تقاضوں کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ برعظیم میں ہندوؤں اور سکھوں کے شانہ بشانہ اور انگریزوں کے زیرِنگیں گزر بسر کرتے کرتے ہماری فکر ودانش پہ افرنگیت کی گہری چھاپ لگ چکی ہے اور ہمارا ایمان ہندوازم کے رنگ میں خوف ناک حد تک رنگ چکا ہے۔ اردو کے معروف افسانہ، خاکہ، ناول اور سفرنامہ نگار ممتاز مفتی اپنی مشہورِ زمانہ کتاب ''رام دین'' میں اسی نام کے انوکھے مضمون میں سچ لکھتے ہیں:

''ہندو ایسی قوم ہے جو گوشت نہیں کھاتی لیکن قوموں کو کھا جاتی ہے''

دین میں اسی ملاوٹ کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے اندر قبل از اسلام کے عرب جہلا والی ساری صفات موجود ہیں۔ اس بات سے کون واقف نہیں کہ اس وقت جھوٹ، مکاری، زنا، شراب نوشی، بے ایمانی، غیر ذمہ داری، رشوت، سفارش، بدعنوانی، شرک، غیبت، منافقت، دھوکہ دہی، بے انصافی، دھونس، دھاندلی، جہیز کا لالچ، شخصیت پرستی، بے راہ روی، اقتدار کی ہوس، جہالت، اخلاقی پستی، ذخیرہ اندوزی، ناجائز منافع خوری، حصولِ زر کی اندھا دُھند دوڑ، دوسروں کی حق تلفی، ہڈحرامی، قتل وغارت گری اور خودغرضی ہمارا قومی نشان بن چکی ہیں۔ یہ موقع ومفاد پرست لوگ

www.urduchannel.in

دین میں معیار کی بجائے مقدار پہ آنکھیں بند کر کے ایمان لا چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے مقلدین اور حلقۂ اثر کے لوگوں کی آنکھوں پہ تعصّبات اور فرقہ پرستی کی اتنی موٹی عینک بلکہ کھوپے لگا دیے ہیں کہ بظاہر اچھے بھلے انسان دین کے معاملات میں کولھو کے بیل بن کر رہ گئے ہیں، جن کی کولھو سے باہر دیکھنے کی صلاحیت ہی سلب کر لی گئی ہے۔

ایسے خوف ناک ملکی حالات میں چاہیے تو یہ تھا کہ زمینِ مقدس کے سفر کی توفیق رکھنے والے لوگ کھلی آنکھوں، فراخ ذہنوں اور کشادہ قلبی کے ساتھ اپنے اور وہاں کے عقاید اور اندازِ عبادت کا مشاہدہ و موازنہ کرتے۔ پھر قرآن و حدیث کی روشنی میں اصل کو اختیار اور بدعت کو ترک کر دیتے لیکن صاحب! بدقسمتی یہاں بھی ہمارے ہم وطنوں کے اوپر اپنے پر پھیلائے رکھتی ہے۔ وہ ہر منظر کو یہاں بھی تعصب اور فرقہ پردازی کی عینک کے اندر سے دیکھتے ہیں۔ ہم نے وہاں اپنے متعدد ہم وطنوں کو برملا اس بات کا اظہار کرتے پایا کہ:

''میں نماز تو امام کعبہ کے پیچھے پڑھ لیتا ہوں لیکن وتر میں ہمیشہ اپنے الگ ہی پڑھتا ہوں کیونکہ میرے محلے یا گاؤں کے مولوی صاحب نے کہا تھا کہ ان وہابیوں کے پیچھے ہمارے وتر نہیں ہوتے۔''

استغفر اللہ، استغفر اللہ، پھر حرم کعبہ میں یہ بھی معمول ہے کہ ہر نماز کے بعد مکہ کے گرد و نواح کے فوت شدگان کی نماز جنازہ بھی پڑھائی جاتی ہے۔ خود ہمارے لیے یہ نئی بات تھی کہ وہاں نماز جنازہ میں صرف ایک جانب سلام پھیرا جاتا ہے۔ یقیناً اس کے پیچھے کوئی ٹھوس تحقیق موجود ہوگی لیکن ہمارے ہم وطن یہاں بھی دوسرا سلام اپنی طرف سے بڑھا دیتے ہیں۔ ظاہر ہے ان کے گاؤں یا محلّے کے لوگ ایسا ہی کرتے ہیں، پھر انھوں نے تاکید کر کے بھی بھیجا ہے۔ مجھے تو یہ سب اضافے، اختلافات، بدعات بالکل ایسے ہی لگتے ہیں، جیسے کسی مولوی صاحب نے سحری کے وقت روزہ داروں کا دل جیتنے کی غرض سے انھیں مخاطب کر کے فرمایا تھا:

''حضرات! سحری کا ٹائم تو ختم ہو چکا ہے، البتہ میں آپ کو پانچ منٹ اپنی طرف سے دے رہا ہوں۔''

اس سلسلے میں سب سے خوف ناک اور دل دکھانے والی بات یہ ہے کہ وطن عزیز کے ایسے ہی

فتنہ پروروں اور دور نا اندیشوں کی چیرہ دستیوں کی بنا پر وطن عزیز کے گلی کوچوں میں ''مکہ کلب'' اور ''مدینہ کلب'' وجود میں آ چکے ہیں۔ ان بدبختوں نے اللہ اور اس کے پیارے رسول کو بھی سیاسی حریفوں کی طرح ایک دوسرے کے مدِّ مقابل لا کھڑا کیا ہے حالانکہ بات بالکل سیدھی سی ہے کہ اللہ اس پوری کائنات کا بلا شرکت غیرے خالق، مالک، رازق، الٰہ اور حاجت روا ہے اور ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اللہ کے نہایت چیدہ، چنیدہ اور برگزیدہ بندے ہیں جو اللہ کی مخلوق اور بار بار بھٹکتی ہوئی انسانیت کو اخلاقیات کا درس دینے کے ساتھ ساتھ انھیں خدائے واحد کی عبادت کرنے اور اسی سے مدد مانگنے کی تلقین کرنے آئے ہیں۔ قوموں کو شرک سے پاک کرنا ہر پیغمبر کے خدائی ایجنڈے کا سب سے پہلا اور اہم ترین نکتہ رہا ہے۔ ہمارے پیغمبر ﷺ کو ان سب میں آخری اور رحمۃ اللعالمین ہونے کا شرف حاصل ہے۔ وحی اور دین کا سلسلہ آپ ﷺ پہ مکمل کر دیا گیا۔ ساتھ ہی آپ ﷺ کی ذات سے غیر مشروط اور سب سے بڑھ کے محبت، دین کی لازمی شرط قرار دے دی گئی۔ بقول شاعر:

محمدؐ کی محبت دینِ حق کی شرطِ اوّل ہے
جو اِس میں ہو ذرا خامی، تو دین اس کا نامکمل ہے

❁❁❁

www.urduchannel.in

31

مرا ایماں ہے زُنّاری

ہم اہلِ عجم اول دن سے قصہ گوئی، فسانہ طرازی اور ڈراما نوازی کے لیے مشہور ہیں۔ ہمارے ایک ہاتھ پہ ہزاروں سال پرانا رنگین و دل رُبا کلچر تھا اور دوسری ہتھیلی پر لاکے ایک سیدھا سادا دین ٹکا دیا گیا۔ ان دونوں کے ساتھ ہمارا جنم جنم کا ساتھ اور لمحے لمحے کا واسطہ تھا۔ ایک طرف رنگوں کی پھوار، دوسری جانب سادگی کا وقار۔ ان دو انتہاؤں کے ساتھ ایک ہی وقت میں نباہ کرنا دشوار تر تھا اور ان میں سے کسی ایک کو چھوڑ دینا تو گویا ممکن ہی نہیں تھا کیونکہ کلچر کا تعلق تو عادات اور رسوم و رواج سے ہوتا ہے اور ماہرینِ نفسیات و حالات بتاتے ہیں کہ عادت کو ترک کرنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ عادات و رسوم کو طلاق دینے کے لیے تو ٹھیک ٹھاک قسم کی آگہی، انتہائی زندہ دلی اور اعلیٰ درجے کا ظرف درکار ہوتا ہے، جس کا برِّصغیر کی آب و ہوا میں ظہور کم کم ہی ہے۔

اردو کے معروف رومانوی ادیب اور فلسفی سجاد علی انصاری (1882ء۔1924ء) تو پہلے ہی انسان کو فرشتے اور شیطان کے درمیان ایک بزدلانہ اور ریاکارانہ سمجھوتے کا نام دیتے ہیں۔ وہ اپنی مشہور تصنیف ''محشرِ خیال'' میں لکھتے ہیں کہ جب قادرِ مطلق فرشتے اور شیطان کی انتہا پسندیوں سے تنگ آ گیا تو اس نے انسان کی صورت میں ایک پیکرِ اعتدال پیدا کر دیا، جو ایک طرف شیطان بننے کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکاری ہے تو دوسری جانب فرشتہ بننے کے لیے جس ریاضت، استقامت اور فعالیت کی ضرورت ہے، یہ اپنی عجلت پسندی اور رنگین مزاجی کی بنا پر اس سے گریزاں ہے، مولانا حالی کے بقول:

فرشتوں سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

یہی وجہ ہے کہ ہم اہلِ عجم نے دو انتہاؤں میں سے کسی ایک سے لَو لگانے کی بجائے ان

دونوں کا ایک چٹ پٹا ملغوبہ (Mixture) تیار کر لیا۔ ہمارا مقامی مزاج ہی ایسا ہے کہ ہم مرچ اور نمک کے اندر چینی ملا کے فروٹ چاٹ اور سکنجبین تیار کرتے ہیں۔ ہم دہی کے اندر دودھ ملا کے لسی تیار کرتے ہیں۔ ہم مٹھاس کے اندر کھٹاس ملا کے ''چٹاس'' بنانے کے عادی ہیں۔ مرزا غالب نے بھی اسی ذہنیت اور مزاج کی نمائندگی کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو مشورہ دیا تھا کہ:

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یا رب!!
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

ہوتے ہوتے ایران و ہندوستان میں کلچر اور مذہب کی کھٹ میٹھی چاٹ تیار ہوتی چلی گئی۔ پھر جس طرح قریب قریب پرورش پانے والے مختلف المزاج درختوں کی جڑیں، شاخیں اور پتے آہستہ آہستہ من تو شدی تو من شدم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ بعینہٖ ہمارے ہاں دین و ثقافت ایک دوسرے میں اس شدت سے مدغم ہوتے چلے گئے کہ بے شمار معاملات میں ان کی الگ سے پہچان بھی ممکن نہ رہی۔ شاعرِ مشرق نے اس مقامی المیے کی جانب کچھ اس انداز سے اشارہ کیا ہے:

ذرا سی بات تھی، اندیشۂ عجم نے اِسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لیے

ایران و توران سے بھی بڑھ کے ہم ہندوستانیوں کے ساتھ المیہ یہ ہوا کہ یہاں ہندی ثقافت پوری طرح پنجے گاڑے ہوئے تھی۔ اس کے رنگ اتنے گہرے اور مزاج ایسا لچک دار تھا کہ پاس آنے والی ہر چیز کو اپنے رنگ میں رنگ لیتی۔ بدھ مت، آریہ اور سکھ اس کی اسی ادا کا شکار ہوئے اور اپنا انفرادی وجود کھو بیٹھے۔

دینِ اسلام سے ہندی ثقافت کی پہلی اور باقاعدہ مُڈبھیڑ آٹھویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہوئی۔ اس نے اپنے مزاج کی نرمی اور جذبات کی گرمی سے بہت جلد اس دین کو بھی اپنی آغوش میں لے لیا۔ پھر اس ہندی کلچر نے حسبِ عادت و روایت آریاؤں اور بدھوں کی طرح اسے بھی ہڑپ کرنے کی پوری کوشش کر ڈالی لیکن اس میں اسے مکمل کامیابی نصیب نہ ہو سکی، بقول ممتاز مفتی: مسلمان قوم ہندی تہذیب کے لیے ''کوکڑو'' ثابت ہوئی۔ اس کی سخت جانی پر اسے حیرت بھی ہے اور غصہ بھی۔ یہ غصہ اس نے یوں اتارا کہ رفتہ رفتہ اس کے انگ انگ میں سرایت

www.urduchannel.in

کرنے کی چالیں چلنا شروع کر دیں۔اس کی تاثیر اور اثر پذیری کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ اس برعظیم پہ صدیوں مسلمانوں کی حکومت رہی لیکن سب سے طاقت ور مغل حکمران جلال الدین محمد اکبر پر تو آج بھی ہم سے زیادہ ہندوؤں کا دعویٰ ہے۔اکبر کے عادات واطوار اُن کے اس دعوے کی تصدیق بھی کرتے ہیں۔

ذرا تاریخ پر نظر دوڑائیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہندی ثقافت نے دین اسلام کو ہڑپ کرنے یا اس کی عربی شناخت ختم کرنے کے کیا جتن نہیں کیے۔انھوں نے اپنی ہولی، دیوالی اور بسنت کو ہماری عید، شبرات کی منھ بولی بہنیں بنا دیا۔شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں اتنی کامیابی سے چلائی گئیں کہ ہمارے دین محمد اور فریدالدین، ان کے سری راموں اور رام گوپالوں سے ہم آمیز ہوکر ''رام دین'' کا روپ اختیار کرنے لگے۔ہماری شادی بیاہ اور تجہیز وتکفین کی رسوم نے مکمل طور پر مقامی ہندی تہذیب کا رنگ ڈھنگ اختیار کرلیا۔ہماری نعتیں اور حمدیں، ان کی ٹھمریوں، دادروں سے گلے مل کے قوالیوں کا وجود اختیار کرتی چلی گئیں۔اس منافقانہ ہندی تہذیب اور ہندو ذہنیت کی چالاکی یا کامیابی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ مذکورہ تہذیب آج سولہ سنگھار کیے، آدھی گھر والی بنی، ہمارے ڈرائنگ روموں میں بیٹھی ہے۔گزشتہ دنوں اخبار میں اپنے وزیروں، سفیروں، وڈیروں، سیاست دانوں اور سینٹروں کو ماتھے پہ تلک لگا کے دیوالی کا جشن مناتے دیکھا تو شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں کے دوررس اثرات پہ آنکھیں بند کر کے ایمان لانا پڑا۔

یہ ڈپلومیسی یا منافقت ہر صاحب بصیرت کی سمجھ سے بالاتر ہے کہ ایک طرف تو ہم ہندو قوم کو اپنا سب سے بڑا دشمن، کشمیریوں کا قاتل، اقلیتوں کا غاصب، مکار اور علاقائی غنڈہ قرار دینے پہ اپنا زور صرف کیے جا رہے ہیں اور دوسری جانب ان کی فلمیں، ڈرامے، گانے، رقص اور تہوار ہمارے لیے حرزِ جاں بنے ہوئے ہیں۔صاحبانِ اقتدار اسے یقیناً ڈپلومیسی، بھائی چارے یا حقِ ہمسائیگی کا نام دیں گے لیکن اصل میں یہ ہندی ثقافت کی سخت جانی اور دوسرے لفظوں میں ہندو کی کامیابی ہے۔

ہم بھول چکے ہیں کہ اگر اس طرح کی ڈپلومیسی، الحاق یا سمجھوتے کی اجازت ہوتی تو آپ سب یقیناً جانتے ہوں گے کہ ایک ایسے ہی سمجھوتے کی پیشکش مکہ کے سرداروں نے آنحضور ﷺ کو کی

تھی کہ آپ ﷺ ہمارے زمینی لات منات اور عزیٰ کو مان لیں، ہم آپ ﷺ کے آسمانی خدا کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ذرا غور فرمائیے کہ کفار مکہ کے ساتھ یہ سمجھوتہ اگر آپ ﷺ وقتی طور پر بھی کر لیتے تو آپ ﷺ مکہ میں رہ کر تبلیغ دین کا فریضہ بہ حسن وخوبی جاری رکھ سکتے تھے لیکن آپ ﷺ نے اس سمجھوتے سے دوٹوک انکار کر کے شدید مصائب اور ہجرت کرنے کو قبول کر لیا کہ خدائے بزرگ و برتر کی یہی منشا تھی، جو انسان کی ساری خطائیں معاف کر سکتا ہے لیکن دین اور توحید میں ملاوٹ، گھلاوٹ اور خواہ مخواہ کی سجاوٹ برداشت کرنے سے یکسر انکاری ہے۔کاش! ہمارے حکمرانوں اور عوام کو بھی ان حالات میں آپ صلی ﷺ جیسی استقامت اور بصیرت عطا ہو جائے۔شاعر مشرق نے تو ہندی ثقافت اور انگریزی افکار سے محفوظ رہنے کے لیے آپ ﷺ ہی طرف رجوع کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

تو اے مولائے یثرب! آپ میری چارہ سازی کر
مِری دانش ہے افرنگی، مِرا ایماں ہے زُنّاری

❁❁❁

www.urduchannel.in

33

خوش نژاد و خوش نہاد و خوش نظر، خیر البشر

اسی مولائے یثرب اور تاجدار بطحا ﷺ کی جنم بھومی میں پاؤں پسارے ہوئے ہمیں تیرہ دن ہو چکے تھے۔ ادھر دل میں یہ خواہش ایک عرصے سے پاؤں پسارے بیٹھی تھی کہ اگر کبھی اس مقدس دھرتی پہ حاضری نصیب ہوئی تو اس محسنِ انسانیت ﷺ کی یادوں اور قدموں کے نشانات کو اپنی پلکوں سے چننے کی سعی کریں گے لیکن ربِ کعبہ اور خانہ خدا کا سحر دل و دماغ پہ ایسا طاری ہوا کہ اس نے کسی اور چیز کی سدھ بدھ نہیں رہنے دی۔ مجھے صلوٰۃ، طواف یا تلاوت سے جب بھی وقت ملتا تو میں بالعموم باب الفتح یا باب الندوہ کی حرم کی طرف اترنے والی سیڑھیوں پر براجمان ہو کر اس مقدس اور روح پرور گھر کی زیارت کرنے لگتا۔ میں یہ بات آپ سے بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ یہ دیدار یا نظارہ مجھ پہ ہمیشہ ایک نئی کیفیت طاری کر دیتا اور کیفیت بھی ایسی کہ جس کے بیان میں محض الفاظ کا سہارا کافی نہیں ہے۔

میں جب بھی اس روح پرور، جاں فزا اور چشم کشا گھر پہ نظر کرتا تو مجھے نہ جانے کتنی صدیاں اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی نظر آنے لگتیں۔ اس کی عظمت بیان کرتے ہوئے تو تاریخ کا سانس پھولنے لگتا ہے۔ اسے دیکھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا کہ جیسے کوئی چیز سیدھی روح میں سرایت کرتی جا رہی ہے۔ اس دیدار میں ایک خاص طرح کے سکون، سرور اور تحفظ کا احساس، حواس پہ طاری رہتا۔ میں آپ کو سچ بتاؤں کہ مجھے تو حکیم الامت کے اس شعر:

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو، ترے عفوِ بندہ نواز میں

کی جو تفہیم اور ادراک ان سیڑھیوں میں بیٹھ کے ہوا، وہ کسی بڑے سے بڑے شارح اور مفسر کے ہاں بھی نصیب نہ ہوتا۔

بارہ نومبر 2003ء بروز بدھ کو سترھویں روزے کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ اس روز مکہ شہر میں آثار رسالت دیکھنے کا اشتیاق مجھے کشاں کشاں حرم کعبہ سے دو تین فرلانگ کے فاصلے پر واقع اس مبارک و مقدس مقام پر لے گیا، جسے فخر کائنات ﷺ کی جائے پیدائش ہونے کا شرف حاصل ہے۔ سعودی حکومت نے اسے کسی مزار یا دربار کی شکل دینے کی بجائے ایک لائبریری میں تبدیل کر کے، اسے دنیا جہان میں چھپنے والی سیرت کی کتابوں سے بھر دیا ہے۔ اس کی پیشانی پر ''مکتبۃ الادارسۃ'' کے الفاظ درج ہیں۔ اندر کا ماحول سکون اور سرور کی جملہ کیفیات اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ خوبصورت قالین، یخ بستہ ائیر کنڈیشنڈ، صاف ستھرا فرنیچر اور تمیز دار عملہ اس عمارت کے تقدس میں اضافے کا باعث ہے۔ دنیا کے بے شمار زبانوں میں سیرت طیبہ کے موضوع پر کتب و رسائل کا یہاں بسیرا ہے۔ اُردو کی کتابوں میں جناب صفی مبارک پوری، کی ''الرحیق المختوم''، ''تعارف مکہ مکرمہ'' اور ''تعارف مدینہ منورہ'' زیادہ نمایاں نظر آئیں۔

میں اس تقدس سے لبریز اور خیر و برکت سے معمور مقام پر بیٹھا اپنے آپ کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھ رہا تھا۔ ذہن و قلب اس تصور کے احساس ہی سے سرشار ہوئے جا رہے تھے کہ میں آج اس باحرمت جگہ پہ بیٹھا ہوں جہاں وجہ کائنات ﷺ نے ظہور پایا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہاں وہ ماہِ منور اور آفتابِ ہدایت و شرافت طلوع ہوا، جس کی کرنیں آج بھی دنیا میں ایمان کی حرارت اور ہدایت کی روشنی تقسیم کر رہی ہیں، یہاں وہ شمعِ رسالت روشن ہوئی جس کے پروانے آج بھی دنیا بھر سے آ کر اس پُرکشش سرزمین کے گرد مستانہ وار گردش کرتے دکھائی دیتے ہیں، مولانا ظفر علی خاں کے الفاظ میں:

وہ شمع اجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز جھلکنے والی تھی سب دنیا کے درباروں میں

اس گھر میں وہ دُرِّ یتیم تولد ہوا جسے کروڑوں غریبوں مسکینوں کا سرپرست بننے کا شرف حاصل ہوا۔ یہ اس عظیم ہستی کا جنم استھان ہے جسے نرینہ اولاد زندہ نہ رہ سکنے کی بنا پر بے نام و نشان رہ جانے کے اتنے طعنے سننے پڑے کہ اللہ تعالیٰ کو دشمنوں کے طعنوں کے جواب اور آپ ﷺ کی ڈھارس کے لیے سورہ کوثر نازل کرنا پڑی۔ یہاں پاس ہی ابوجہل اور ابولہب کے گھر ہوا کرتے

www.urduchannel.in

تھے، جن کو اپنی سرداری اور بے شمار بیٹوں پہ بہت ناز ہوا کرتا تھا لیکن آج ان سرداروں کا نام لوگوں کی لعنت ملامت کے لیے باقی ہے اور نرینہ اولاد سے محروم پیغمبر ﷺ کے نام لیواؤں بلکہ دیوانوں کا شمار کرنا دشوار ہوا پڑا ہے۔

آپ ﷺ کی پیدائش کے وقت جس خانہ کعبہ میں لات، منات، عزیٰ سمیت تین سو ساٹھ بت ہوا کرتے تھے، آج وہاں سال کے تین سو پینسٹھ دن خدائے واحد کے نام کی مالا جپی جاتی ہے، اللہ کے رسول پر درود بھیجا جاتا ہے۔ سال بھر میں شاید ہی کوئی لمحہ ایسا آتا ہو کہ یہ اللہ کے پروانوں اور نبی ﷺ کے دیوانوں سے خالی ہوتا ہو، جہاں کبھی ننگے بدن طواف ہوتا تھا، آج وہاں دنیا جہان کے عقیدت مند ننگے پاؤں گامزن ہیں اور اللہ نے چاہا تو قیامت تک اس میں کسی خلل کا کوئی اندیشہ نہیں۔

بعض عجلت پسند عقیدت منداپنے جذبات کا اظہار یہاں بھی سجدہ ریزی کے ذریعے کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن لائبریری کا پُرسکون و پُرسکوت عملہ ان کے سجدوں کا رُخ اصل قبلہ کی جانب موڑنے کے لیے ہمہ وقت مستعد رہتا ہے۔

وہاں بیٹھے ہوئے یہ خیال بھی ذہن اور دریچے پر دستک دیتا رہا کہ ہم ایک ایسے نبی ﷺ کے امتی ہونے کے دعوے دار ہیں جو لوگوں کو دے کے خوش ہوتے تھے، عزت، توجہ، شعور، حتیٰ کہ اگلے وقت کا کھانا اور منھ کا نوالہ بھی لیکن ہم کیسے ہوس پرست اور لالچی ہیں کہ کسی کو دینا تو درکنار، کچھ لے کے بھی خوش نہیں ہوتے بلکہ مزید کے لالچ میں پڑ جاتے ہیں، مستقبل کی فکر میں حال کا خانہ خراب کر لیتے ہیں۔ سچ ہے! اللہ جس سے سچی خوشیاں چھین لیتا ہے، اسے ہوس کی دولت سے مالا مال کر دیتا ہے۔ اور کسی دانش مند کا قول ہے:

''ہوس کے پیٹ کو صرف قبر کی مٹی سے بھرا جا سکتا ہے۔''

ایک حدیث پاک بھی ہے کہ:

''سب سے بُرا برتن پیٹ ہے۔''

پھر یوں ہوا کہ وہاں بیٹھے بیٹھے سوچوں کی کشتی پر سوار ہو کر صدیوں کا سفر کرتے کرتے میری عقیدت اور میرے تفکرات ہم آمیز ہو کر حفیظ تائب کے لفظوں کا روپ اختیار کرتے چلے گئے:

0000

خوش خصال و خوش خیال و خوش خبر، خیر البشرؐ
خوش نژاد و خوش نہاد و خوش نظر، خیر البشرؐ
رونما کب ہوگا راہِ زیست پر منزل کا چاند
ختم کب ہوگا اندھیروں کا سفر، خیر البشرؐ
کب ملے گا ملتِ بیضا کو پھر اوجِ کمال
کب شبِ حالات کی ہوگی سحر، خیر البشرؐ

❁❁❁

www.urduchannel.in

35

بطحا کی وادیوں میں

رمضان المبارک کی پیش قدمی کے ساتھ ساتھ زائرین کی تعداد بھی روز افزوں تھی۔ یار لوگوں نے اپنے قافلے کو اکٹھا رکھنے کے لیے باب الندوہ کے آس پاس ایک جگہ مقرر کر رکھی تھی۔ احباب صلوٰۃ وطواف یا غسل اور وضو کے فرائض نمٹا کے یہیں آ کے قیام کرتے۔ اس جگہ کو محور و مرکز بنانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں سے غسل خانے، مارکیٹ، ہوٹل اور دیگر اشیائے ضرورت کا حصول قریب تر اور آسان ترین تھا۔ آبِ زم زم کا منبع و مرکز بھی اسی دروازے کے آس پاس ہے۔ زمانہ آگاہ اور گواہ ہے کہ اِس فرسِ آب کو ننھے منے اسماعیل علیہ السلام نے ایسی ایڑ لگائی ہوئی ہے کہ یہ اب قیامت تک رکنا دکھائی نہیں دیتا۔

پاکستان سے روانہ ہوتے ہوئے متعدد دوستوں نے کچھ رابطے اور حوالے ساتھ کر دیے تھے جو بوقت ضرورت کام آنے والے تھے۔ تجربہ کار حجاج کرام نے اندرون حرم بعض آسائشات حاصل کرنے کے کئی طریقے ایجاد کر رکھے تھے۔ انھوں نے حرم کے بعض پاکستانی ملازمین کے ساتھ دوستیاں اور پینگیں بڑھا رکھی تھیں۔ وہ گھر سے ہی ان ملازمین کے لیے مختلف تحائف لے کے چلتے تھے اور وہاں صفائی ستھرائی کرنے والوں کے بچوں کا نام لے لے کے خیریت دریافت کرتے تھے۔ وہ بھی حسب توفیق ان لوگوں کی خبر گیری کو آن موجود ہوتے۔ ہماری حیثیت تو ان لوگوں میں طفل مکتب کی سی تھی۔ اصولی طور پر تو ہمیں ان حضرات کے اثر و رسوخ پہ جل بھن جانا چاہیے تھا کیونکہ بقول عبدالحمید عدم:

گلے ملتے ہیں جب کوئی دو بچھڑے ہوئے ساتھی
عدم ہم بے سہاروں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے

لیکن اس دیس میں قادرِ مطلق نے ایسی دست گیری کی کہ کسی سہارے کی ضرورت محسوس

ہونا تو کجا کسی کو ٹیلی فون کرنے کا بھی خیال نہیں آیا۔ سچ پوچھیں زندگی کے بہت سے مواقع پہ یہی شعر میری سرشاری کا سبب بن جاتا ہے:

جانے کیا کیا سکون ملتا ہے
جب کوئی آسرا نہیں ہوتا

البتہ ہمارے ایک عزیز نے محبت بھری چالاکی یہ کی کہ مکہ مکرمہ میں مقیم اپنے داماد کو ہمارے ٹھکانے کی خبر کر دی، مقامی ماحول سے آشنا ہونے کی بِنا پر جس نے آناً فاناً ہمارا سراغ لگا لیا۔ یہ نوجوان شاہدرہ کا حاجی زاہد تھا جو مکہ میں ٹیکسی چلاتا تھا۔ اس کا ایک بھائی ہوٹل کا کاروبار کرتا تھا۔ اس نے اپنے سسرال اور گاؤں میں میرے دیرینہ آشنا میاں لطیف صاحب کی ہدایت پر عرصہ قیام تک کے لیے سواری اور کھانے، ٹھکانے کی پُر اِصرار پیش کش کر دی، جسے ہم نے شکریے اور محبت کے ساتھ ٹال دیا۔ اس کے باوجود گاہے گاہے اس کا اصرار جاری رہا۔ جس دن ہم نبی معظم ﷺ کے آبائی مکان کا دیدار کر کے لوٹے، تو آپ ﷺ سے وابستہ دیگر مقامات کے دیدار کی خواہش کو بھی پر لگنے شروع ہو گئے۔

بارہ نومبر کی رات ہم حسب معمول باب الندوہ والی سیڑھیوں پر براجمان دیدار بیت اللہ سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اوپر کی جانب نظر کی تو چاند آسمان کی سیڑھی لگائے خانہ کعبہ کے عین اوپر محویت کے عالم میں اپنے خالق کی بندگی کا نظارہ کر رہا تھا۔ چلنا اور حرکت کرنا تو لگتا ہے اس کے معمولات میں شامل ہی نہ تھا۔ چاند کے قدم اس وقت من من کے ہوئے پڑے تھے اور اپنی صورت حال تو شاید میر کے اس شعر سے واضح ہو سکے:

رات محفل میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

لطف و سرور کا یہ سلسلہ ہمیں پوری طرح اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا کہ حاجی زاہد کا اصرار ایک بار پھر نمودار ہوا۔ ہم بھی اپنی تیرہ روزہ بھرپور مکی زندگی کے بعد اس کے مضافات میں جھانکنے کا عندیہ لیے بیٹھے تھے، اس لیے اب کے ہم نے حاجی زاہد کی پیش کش کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیا۔ عبادات کے علاوہ دیگر امور کے لیے وہاں فجر تا ظہر موزوں ترین وقت ہے۔ حاجی زاہد نے طے

www.urduchannel.in

شدہ پروگرام کے مطابق تیرہ نومبر کی صبح نماز فجر کے بعد ہمیں باب الفتح کے باہر ''وردہ مودہ'' سے ساتھ لیا۔ سفید رنگ کی گاڑی پہ (146 ب ار) کا نمبر درج تھا۔ یہاں اس بات کا تذکرہ کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ وہاں تمام گاڑیوں پہ ان کی اپنی زبان میں نمبر پلیٹیں لگی ہیں۔ اس سلسلے میں وہ کسی احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی بجائے فخر وافتخار کا تمغہ ماتھے پہ سجائے ملتے ہیں۔ ہر گاڑی پر ہندسوں والے نمبر کے ساتھ ہمارے مانوس عربی اُردو رسم الخط میں تین حرف درج ہیں۔ بعض گاڑیوں پہ یہ تین حروف مفہوم ومعانی کے اعتبار سے عجب گل کھلاتے نظر آتے۔ کسی کسی گاڑی پر تو یہ حروف ہماری مقامی زبان میں ڈھل کر ایسا خوف ناک اور انوکھا مطلب ادا کر رہے ہوتے ہیں کہ لگتا ہے اس گاڑی پہ تین حروف درج نہیں کیے بلکہ بھیجے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ب ط خ، د غ ا، ع ا ر، د ف ع، ض ر ب، ق ب ر، ز ن ا، س و ر اور ب ر ص وغیرہ۔

پونے سات بجے ہم جنت المالا پہنچے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا دفن ہیں۔ خاتون جنت، نبی معظم ﷺ کی پہلی شریک حیات، خواتین میں سب سے پہلے اسلام کا ذائقہ چکھنے والی۔ مکہ میں آپ ﷺ کے کردار واخلاق اور انتظامی صلاحیتوں کی سب سے بڑی قدر دان، پہلی وحی کے اضطراب میں آپ ﷺ کی ڈھارس بندھانے والی اور اعلانِ نبوت اور تبلیغ کے دشوار ترین مراحل میں آپ ﷺ کے عزائم کو استقامت عطا کرنے والی یہ اُم المومنین، اسی قبرستان میں محوِ خواب ہیں۔

اہلِ سُنت ہونے کا دعویٰ کرنے والوں کے لیے آنحضور ﷺ کی ازدواجی زندگی کے اہم ترین واقعے میں بھرپور غور وفکر کی ضرورت ہے کہ یہاں شادی کا پیغام خاتون کی طرف سے موصول ہو رہا ہے، خاتون بیوہ ہے اور خاتون آپ ﷺ سے عمر میں پندرہ سال بڑی ہیں۔ یعنی زندگی کی چالیس بہاریں دیکھ چکی ہیں۔ اس سلسلے کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ان دونوں معاملات میں ناپسندیدگی یا تامل کا اظہار کرنے کی بجائے ہر سلسلے کو برضا و رغبت قبول فرمایا۔ اس لیے کہ آپ ﷺ کی زندگی کا ہر قدم اللہ کے حکم کے مطابق اٹھتا تھا اور آپ ﷺ کے ہر عمل کو امت مسلمہ کے لیے روشن مثال بننا تھا۔ آج اہلِ اسلام اور بالخصوص پاکستانی مسلمانوں کو غور وفکر کی ضرورت ہے کہ وہ فخرِ کائنات ﷺ کی زندگی کے ان ابتدائی اور اہم ترین پہلوؤں کو کس

نظر سے دیکھتے ہیں۔

ہماری کار فراٹے بھرتی ہوئی تھوڑی ہی دیر میں جبلِ ثور کے سامنے پہنچ چکی تھی۔ یہ ایک وسیع وعریض اور بلند وبالا پہاڑ ہے جس کے اوپر چڑھنا آج بھی دشوار نظر آتا ہے۔ اچھا بھلا تندرست آدمی یہ مسافت طے کرتے ہوئے ہانپنے لگتا ہے۔ اسی پہاڑ کے اوپر وہ غار واقع ہے جہاں رحمتہ اللعالمین ﷺ نے مکہ سے ہجرت کر کے دشمنوں کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی معیت میں پناہ لی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اسی نسبت سے یارِ غار بھی کہا جاتا ہے۔ ہجرت..... بظاہر تو چار حرفی لفظ ہے جس کے لغوی معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو جانا کے ہیں لیکن اگر اس کے نتائج وعواقب کو دیکھا جائے تو کسی بھی حساس آدمی کے لیے یہ دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ جس شہر کے گلی کوچوں میں بچپن اور جوانی گزرے ہوں، وہاں سے کوچ کرنا کارِ محال میں شمار ہوتا ہے۔ شیخ ابراہیم ذوق نے ایسے ہی تو نہیں کہا تھا کہ:

کون جائے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

میر تقی میر نے تو اس مرحلے کو موت کا ہم پلہ قرار دیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

یوں اٹھے آہ اُس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

❁❁❁

www.urduchannel.in

37

جاتے میں قدم اور تھے، آتے میں قدم اور

بعض دانش مندوں نے تو ہجرت کے عمل کو جسم اور روح کی جدائی کے مشابہ قرار دیا ہے۔ آنحضور ﷺ نے مکہ میں اپنی زندگی کے بہترین ترپن (53) سال بسر کیے تھے، مکہ کی سرزمین آپ ﷺ کو دل و جان کی طرح عزیز تھی۔ اس شہر کے در و دیوار پہ آپ ﷺ کی صداقت، امانت داری اور حسنِ عمل کی مہریں ثبت تھیں۔ یہ وہی شہر تھا جہاں مقامی زعما کی ایک آدھ شرط مان لینے پر آپ ﷺ کو متفقہ سردار مانا جا سکتا تھا، مکہ کی خوبصورت ترین عورت آپ ﷺ کے نکاح میں آنے کو تیار تھی، سونے چاندی کے ڈھیر آپ ﷺ کے قدموں میں نچھاور ہونے کے لیے ایک اشارہ ابرو کے محتاج تھے لیکن آپ ﷺ نے رضائے ربی کی خاطر ان تمام دنیاوی آسائشات کو تو پہلے ہی ٹھوکر مار رکھی تھی۔ جب اللہ تعالیٰ کا حکم آیا تو یہ عزیز ترین شہر بھی چھوڑ دیا۔ ربِ رحیم کی فرماں برداری کا صلہ یہ ملا کہ چند سال بعد اسی شہر میں آپ ﷺ یک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے۔

ہماری گاڑی مکہ سے طائف جانے والی سڑک پہ رواں دواں تھی کہ ایک سنگ میل پہ میری نظریں جمی کی جمی رہ گئیں۔ وہاں تحریر تھا ''طائف 27 کلومیٹر۔'' اس سہ لفظی عبارت نے میرے زخشِ تخیل کو ایک بار پھر ماضی میں جست لگانے پر مجبور کر دیا۔ ہم آج تک تاریخ اور نصاب کی کتابوں میں یہی پڑھتے آئے تھے کہ نبی محترم ﷺ تبلیغ دین کے لیے مکہ کی قریبی بستی طائف میں تشریف لے گئے، جہاں لوگوں نے آپ ﷺ کے ساتھ بدسلوکی کی اور پھر آپ ﷺ زخمی حالت میں واپس تشریف لے آئے۔ اس طرح کی عبارات سے بہ ظاہر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ مکہ اور طائف کے درمیان لاہور اور شاہدرہ جتنا فاصلہ ہی ہوگا، جہاں سے زخم کھانے اور ان لوگوں کے لیے دعا کرنے کے بعد آپ ﷺ واپس لوٹ آئے لیکن یہاں آ کے اندازہ ہوا کہ کسی بھی علاقے کے حالات و واقعات تحریر کرنے والے مورخین یا مصنّفین کو وہاں کے زمینی حالات کا ضرور جائزہ

لینا چاہیے۔ ہمیں مکی معاشرے میں نبی اکرم ﷺ کی معاشرتی مشکلات کا احساس تو تھا لیکن آپ ﷺ کی جغرافیائی کٹھنائیوں کا اندازہ یہاں آ کے ہوا۔

مکہ سے طائف کا درمیانی راستہ آج بھی بلند و بالا اور بے آب و گیاہ پہاڑوں سے اٹا پڑا ہے۔ طائف کو جانے والی سڑک پہاڑوں کا سینہ چیر کے بنائی گئی ہے۔ پانی اور سائے کا وجود وہاں تلاش کرنا آج بھی کارِ دارد ہے۔ پھر عرب کے درجہ حرارت سے آپ سب لوگ آگاہ ہیں۔ آپ ذرا تصور کیجیے کہ طائف جاتے ہوئے تو یہ دشوار گزار راستہ کسی نہ کسی امید میں کٹ گیا ہوگا لیکن زخم کھائے ہوئے وجود اور مجروح احساسات کے ساتھ ستائیس کلومیٹر کا یہ کشٹ کاٹنا پہاڑوں سے بھی بلند و بالا حوصلے اور اللہ تعالیٰ کی خصوصی اعانت و استعانت کے بغیر ممکن نہ تھا۔ استاد قمر جلالوی نے موسیٰ علیہ السلام کی کوہ طور کی جانب روانگی کے اشتیاق اور واپسی کے اضطراب کو دیکھیے کس مہارت اور خوبصورتی کے ساتھ ممیّز کیا ہے:

موسیٰ سے ضرور آج کوئی بات ہوئی ہے
جاتے میں قدم اور تھے، آتے میں قدم اور

ہجرتِ مدینہ کی صورت حال بھی بالکل ایسی ہے۔ ہم کتابوں میں یہ تو پڑھتے ہیں کہ آنحضور ﷺ اور آپ ﷺ کے ساتھی کفار مکہ کے رویے سے تنگ کر مدینہ ہجرت کر گئے لیکن ان واقعات کا راوی یہ وضاحت نہیں کرتا کہ اس ہجرت کے وقت عرب کا درجہ حرارت کتنا تھا؟ تپتے ہوئے ٹیلوں، نہ ختم ہونے والے میلوں اور دہکتے ہوئے پہاڑوں کی درشتی کا کیا عالم تھا؟ اللہ اور اس کے دین کی خاطر اپنا گھر بار اور رشتے دار چھوڑ دینا یقیناً ایک بڑی قربانی ہے لیکن اس جذبے کے ساتھ اگر تین ساڑھے تین سو کلومیٹر کا تھکا دینے، ڈرا دینے اور جلا دینے والا ذہنی، زمینی اور پہاڑی سفر بھی شامل کر لیا جائے تو اس جذبے کی شدت، حدت اور استقامت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج بھی اعلیٰ ترین سڑکوں پر بڑی بڑی مضبوط ہینو بسیں یہ فاصلہ طے کرتے ہوئے ہانپنے لگتی ہیں۔ ان موسمی اور جغرافیائی حالات سے آگاہی رکھتے ہوئے ہجرت مدینہ کی کیفیت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ایسے میں جب ہم سنتے ہیں کہ اللہ والوں کا ایک قافلہ مدینہ سے چل کے حج کی نیت سے مکہ کے نواح میں پہنچا اور کفار مکہ نے اس قافلے کو بغیر حج کے واپس لوٹا دیا تو مسلمانوں

www.urduchannel.in

کے کرب، ظرف اور کفار کی زیادتی و درشتی کا درجہ حرارت بھی معلوم ہو جاتا ہے۔

جبلِ ثور کی زیارت کے بعد ہم عرفات کی جانب روانہ ہو گئے۔ مکہ سے عرفات کے لیے آج آٹھ سڑکیں تعمیر کی جا چکی ہیں۔ ہم اس وقت آٹھ نمبر کی سڑک پر تھے۔ ابھی صبح کا وقت تھا، اس کے باوجود سورج ہماری پیشانیوں کا نشانہ لیے کھڑا تھا۔ حج کے دنوں میں یہاں کھوے سے کھوا چھلتا ہے لیکن آج کل یہ تمام راستے سنسان پڑے تھے۔ اکا دکا زائرین پیدل یا کسی گاڑی میں چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔ مزدلفہ میں سے گزر کر ہم اس مقام پر پہنچ گئے، جسے سڑکوں کا پنجند بلکہ آٹھ ند کہا جا سکتا ہے کیونکہ مکہ سے آنے والے تمام راستے یہاں آ کے مل جاتے ہیں۔

آگے چلے تو دائیں جانب مسجد نمرہ کے چھے مینار اور تین گنبد نظر آنا شروع ہو گئے۔ یہ مسجد سال میں ایک بار خطبۂ حج کے لیے کھولی جاتی ہے۔ میدانِ عرفات میں اس وقت غسل خانوں کی قطاریں کھڑی تھیں یا نیم کے ہرے بھرے درخت کسی نوزائیدہ باغ کا منظر پیش کر رہے تھے۔ نیم کے یہ درخت پتھریلی زمین کھود کے اور کھودے ہوئے گڑھوں میں زرخیز مٹی بھر کے اگائے گئے ہیں۔ سنا ہے کہ یہ کڑوا تحفہ سعودی عرب کو جنرل ضیاء الحق کی دین ہے۔ لیکن یہ عین حقیقت ہے کہ ان درختوں کو یہ سچ مچ کی پاک سرزمین خوب راس آئی ہے۔ ایک تحقیق کی حسرت البتہ میرے دل میں رہی کہ ان پودوں کو چکھ کے دیکھا جاتا کہ ہمارے یہ پاکستانی پودے مقامی لوگوں کی طرح یہاں آ کے بھی اپنی کڑواہٹ دل میں چھپائے بیٹھے ہیں یا ماحول کے تقدس نے ان کے بطون کو کسی الوہی چاشنی سے ہم کنار کر دیا ہے۔

حج کے دنوں میں ان پودوں کے درمیان خیموں کی فصل بھی آگ آتی ہے جو دنیا بھر سے آئے ہوئے حجاج کرام کو اپنے سوتی گھروں اور ناسوتی پروں میں سمیٹ لیتی ہے۔ گزشتہ دنوں ہونے والی بارش کے بارے میں حاجی زاہد نے بتایا کہ اس نے مکہ میں گزشتہ چالیس سالہ بارش کا ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردگرد کے تمام پودے اور کہیں کہیں اگا ہوا سبزہ دھلا دھلا اور نکھرا نکھرا نظر آ رہا تھا۔ نوخیز دھوپ نے اس سبزے کو تمازت کی بجائے طراوت سے ہم کنار کر رکھا تھا۔ فطرت نگار اقبال پاسبانِ عقل کی طرح یہاں بھی پاس پاس تھا:

38

0000

برگِ گل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سورج کی کرن
حسنِ بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لیے
ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

چلتے چلتے یہ دو رُکنی قافلہ جبلِ رحمت کے عین سامنے پہنچ گیا۔ یہ ایک چبوترہ نما مختصر سا پہاڑ ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے قدرتی طور پر اسے ایک سٹیج کا روپ عطا کیا گیا ہے۔ ہم گاڑی پارک کر کے سیڑھیوں کے ذریعے جبل رحمت کے اوپر پہنچے، وہاں پہ موجود ایک چوکور مینار پر ہمارے بھائی بندوں نے رنگا رنگ روشنائیوں یا سیاہیوں سے اپنے نام لکھ رکھے تھے۔ نام یہاں بھی سارے ہمارے پاکستانی بھائیوں کے تھے۔ میں سوچنے لگا: ہم کتنے سہل پسند لوگ ہیں کہ لوگوں کے دلوں پہ اپنے نام و نقوش کندہ کروانے کی بجائے رنگوں، سیاہیوں، چاقوؤں اور دیواروں کا سہارا لیتے ہیں۔ سوچ کے اسی عالم میں اقبال کی آواز پھر گونجی:

نقش ہیں سب نا تمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

❁❁❁

www.urduchannel.in

39

حاجیوں کے تعاقب میں

''یہ وہی جبل رحمت ہے جہاں قیامت کے روز قادرِ مطلق
پوری خلقت کو اکٹھا کرے گا۔''

حاجی زاہد نے سرگوشی کی۔

ہم نے صحیح پاکستانی اور روایتی محقق ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اول تو پوری دنیا کے لوگوں اور بالخصوص مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پہ اکٹھا کرنا مشکل کام ہے اور دوسرے یہ جگہ اتنی ہے کہ یہاں تو محض ضلع شیخوپورہ کے عوام بھی سمٹتے نظر نہیں آتے۔

''ورک صاحب! یہ کمپیوٹر کا دور ہے۔ اس ایجاد میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ بے شمار data زپ کی کمانڈ کے ذریعے ایک چھوٹی سی فلاپی، سی ڈی یا فلیش ڈرائیور میں قید کیا جا سکتا ہے۔ دنیا جہان کی معلومات اور کھیل تماشے ایک مختصر سی ہارڈ ڈسک میں بند ہیں۔ یہ سارا کمال ایک انسانی ایجاد کردہ پرزے کا ہے۔ وہ تو خود اللہ تعالیٰ ہے۔ ہوسکتا ہے وہ انسانوں کے خون میں شامل لاکھوں کروڑوں خلیوں میں سے ایک خلیے کو نمائندہ بنا کے اپنے ہاں حاضر کر لے۔ ویسے بھی یہاں پہ روحوں کو اکٹھا کیا جائے گا، جسموں کو نہیں۔''

میٹرک پاس حاجی زاہد کی ذہانت و بصیرت نے ہمیں واقعی حیرت زدہ کر دیا۔

جبلِ رحمت اور میدانِ عرفات میں اپنے مختصر قیام کو اپنی کسی اگلی جسمانی، روحانی یا خیالی حاضری تک ملتوی کرتے ہوئے ہم وہاں سے مزدلفہ کی جانب واپس روانہ ہوئے۔ مزدلفہ وہی مقام ہے جہاں سے شیطانوں کو مارنے کے لیے کنکریاں حاصل کی جاتی ہیں۔ یہاں جی چاہتا ہے

کہ حجاج کو مشورہ دیا جائے کہ حجاز مقدس سے لائے جانے والے تحائف میں ایک پیکٹ، ان کنکریوں کا بھی اہتمام کے ساتھ شامل کیا جائے اور گاہے گاہے، ارد گرد اور باطن کے نہاں خانوں میں ظاہری و پوشیدہ شیاطین کا نشانہ لیتے رہیں۔

حجاجِ کرام ظہر اور عصر (ظہرین) کی نمازیں عرفات میں ادا کرتے ہیں جب کہ مغرب اور عشاء (مغربین) مزدلفہ میں آ کے پڑھتے ہیں۔ اس وسیع و عریض علاقے میں راستے کی بھول بھلیوں کو ہمارے گائیڈ نے بہ حسن و خوبی آسان بنایا۔ منیٰ میں خیموں کی قطاریں بڑی دور تک ساتھ چلتی ہیں۔ پہلے پہل یہاں کپڑے کے خیمے لگائے جاتے تھے لیکن ہمارے ایشین بھائیوں کی مختلف مقاصد کے لیے آگ جلانے کی عادت اکثر کسی نہ کسی حادثے کا سبب بن جاتی تھی۔ اب ان کے لیے فائبر گلاس کے فائر پروف خیمے نصب کر دیے گئے ہیں۔ حاجی یہاں پہ پانچ دن قیام کرتے ہیں۔ آٹھ ذوالحج سے قبل یہاں پہلی حاضری لازمی ہے۔ بعض لوگ من پسند خیموں کے حصول کے لیے چھے یا سات کو بھی پہنچ جاتے ہیں۔ نو ذوالحج کو فجر کی نماز منیٰ میں ادا کر کے حاجی عرفات روانہ ہو جاتے ہیں۔

منیٰ کی وسیع و عریض مسجد چار میناروں کے بازو پھیلائے کھڑی ہے۔ حجاجِ کرام بالعموم پانچوں روز یہیں نماز ادا کرتے ہیں، بعض اپنے اپنے خیموں میں پڑھ لیتے ہیں۔ منیٰ کے ساتھ ہی الجمرات ہے جہاں تین علامتی شیطان نصب ہیں۔ مزدلفہ سے جیب یا پرس میں ڈالی ہوئی کنکریوں کا پریکٹیکل یہاں پہ ہوتا ہے۔ بعض ظاہر بین حضرات جنھوں نے دل میں چھپے شیاطین کو کبھی فٹے منہ بھی نہیں کہا، وہ پاؤں سے جوتے اتار کے ان پتھروں کو پھینٹی لگانے لگ جاتے ہیں۔ ہم نے بھی داہنی جیب میں چھپائی ہوئی ایک کنکری چپکے سے نکالی اور ڈرتے ڈرتے سب سے چھوٹے شیطان کی طرف اچھال دی۔ بعض احباب مطمئن رہیں کہ ہم نے دونوں بڑے شیطانوں کے پاس سے گزرنے کے باوجود اپنی ازلی بزدلی اور روایتی صلح جوئی کے سبب، انھیں میلی آنکھ سے دیکھنے کی بھی جرأت نہیں کی۔

منیٰ کی حدود یہیں پہ ختم ہو جاتی ہیں۔ یہاں کی بعض سڑکیں دیکھ کے تو وطن عزیز بے طرح یاد آنے لگتا ہے۔ ہوسکتا ہے سعودی حکومت نے پاک عرب دوستی کی یاد میں ان سڑکوں کو ان کے

www.urduchannel.in

حال پہ چھوڑ رکھا ہو۔ واپسی پر ہم جبلِ نور کی طرف سے مکہ میں داخل ہوئے۔ یہ وہی جبلِ نور ہے جس کے اوپر اسلام کی پہلی درس گاہ اور نبی مکرم ﷺ کی پسندیدہ پناہ گاہ غارِ حرا واقع ہے۔ یہ پہاڑ مسجدِ حرام اور آپ ﷺ کے آبائی مکان سے پانچ چھے کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور پہاڑ کی بلندی جبل نور سے بھی زیادہ ہے۔ اس پہاڑ کے اردگرد کی پوری آبادی کا نام بھی جبلِ نور ہی ہے۔ جبلِ نور روڈ کی ظاہری حالت بھی لاہور کی مضافاتی سڑکوں جیسی ہے۔ ایک ہی بارش نے علاقائی سڑکوں کا پول کھول دیا ہے یا شاید پوری دنیا کے مضافات ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ رات کی تہذیب یہاں بھی پوری طرح اپنے پنجے گاڑے ہوئے ہے اور دن کے وقت ان مضافات میں بھی کسی مقامی آدمی کا مل جانا کسی معجزے سے کم نہیں۔

اسی پہاڑ کے اوپر وہ مقدس غار اور مقام ہے، جسے دین اسلام کا نقطہ آغاز بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس دشوار گزار راستے کو طے کرنا آج بھی کسی مہم سے کم دکھائی نہیں دیتا حالانکہ اس راستے کو سہل بنانے کی متعدد کاوشیں کی جا چکی ہیں۔ آپ ﷺ کی زندگی کا یہ پہلو بھی نہایت حیران کن ہے کہ ابھی آپ ﷺ کو نبوت بھی عطا نہیں ہوئی۔ وحی کا سلسلہ بھی آغاز نہیں ہوا۔ باقاعدہ عبادات کا معاملہ بھی ابھی ناقابل فہم ہے، کسی قبیلے یا گروہ سے عداوت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ازدواجی زندگی اس قدر خوش گوار ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اکثر آپ ﷺ کے ہمراہ یہ دشوار تر مسافت طے کرتی نظر آتی ہیں۔ ایسے میں آپ ﷺ کی گوشہ گیری اور عزلت نشینی انسانی فہم سے بعید ہے۔

اس سلسلے میں مختلف قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ اسے قریش کی جاہلانہ ومشرکانہ رسوم اور عاداتِ بد سے گریز پائی کا شاخسانہ بھی قرار دیا جاتا ہے۔ بعض لوگ اس کے ڈانڈے مشاہدہ فطرت اور مطالعہ کائنات سے بھی ملاتے ہیں۔ پھر اس گوشہ نشینی کو مختلف مذاہب کے مطالعے کے شوق پہ بھی محمول کیا جاتا ہے لیکن سچی بات یوں ہے کہ یہ تمام قیافے اور اندازے اس انوکھی، منفرد اور سخت کوش بالا نشینی کا پیٹ بھرتے نظر نہیں آتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اعلانِ نبوت کے بعد انسانیت کو قدم قدم عظمت وعروج کا راستہ دکھانے والے پیغمبرِ عظیم ﷺ کی جانب سے زمین زادوں کے لیے یہ بھی بلند نشینی کا علامتی پیغام تھا۔ مولانا ظفر علی خاں نے سچ کہا تھا کہ:

دنیا میں رحمتِ دو جہاں اور کون ہے؟
جس کی نہیں نظیر وہ تنہا تمھی تو ہو

حاجی زاہد نے ظہر کی نماز سے پہلے پہلے ہمیں باب الفتح کے سامنے لا اتارا، اور ہم پھر سے اپنے رنگا رنگ حاجیوں کے قافلے میں لوٹ آئے۔ آج کا دن ہمارے لیے اللہ اور اس کے پیارے رسول ﷺ سے خصوصی قربت کا دن تھا۔ مکہ سے مدینہ کا سفر و قیام اگرچہ پہلے سے ہمارے شیڈول کا حصہ تھا لیکن نبی محترم ﷺ کی بعض نشانیاں، ٹھکانے اور راستے دیکھ کر آپ ﷺ کی ہجرت کی رسم ادا کرنے کے لیے بھی دل مچلنے لگا۔ دل میں اس شہر کی زیارت کی حسرت جاگی جسے پہلی اسلامی ریاست ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ آنکھیں ان گلیوں کے دیدار کے لیے ضد کرنے لگیں جہاں سے مہاجرین کا ایک لٹا پٹا قافلہ ایک ناقابلِ شکست لشکر بن کے نکلا۔ اگرچہ ہم اس بات سے آگاہ تھے کہ ہمارا آج کا سفر ائیر کنڈیشنڈ بسوں میں طے ہوگا لیکن پھر دل کو اس بات سے مطمئن کر لیا کہ اس عظیم ہستی کے ساتھ راستے سمت اور منزل کا اشتراک بھی کوئی معمولی سعادت تو نہیں۔

❁❁❁

40

0000

www.urduchannel.in

41

اپنا مدار، اپنا مدینہ جُدا کرو

پندرہ نومبر کی رات حرم کعبہ میں نماز تراویح ادا کرنے کے بعد ہمارا مختصر سا قافلہ رات کے اندھیرے میں مدینہ منورہ کی بس پر سوار ہو گیا۔ یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ہمارے قافلے کے بیشتر افراد اب تک مدینہ سے ہو کر مکہ پہنچ چکے تھے۔ اب یہ قافلہ چار افراد پر مشتمل تھا، جن میں راقم کے ساتھ والدہ محترمہ، جناب اقبال رندھاوا اور ان کی ایک عزیزہ شہناز شامل تھے۔

ہماری بس مکہ سے رات ٹھیک بارہ بجے روانہ ہوئی۔ اس لمحے میں سوچ رہا تھا کہ آنحضور ﷺ کی اس شہر سے روانگی کا بھی شاید یہی وقت ہو؟ رات کی یکسانیت تو بہر حال موجود تھی۔ رات کے اندھیرے میں بیرونی مناظر کی عیاشی سے ہم مکمل طور پر محروم رہے۔ رات پونے تین بجے بس مقامی ترین عربوں بلکہ بدوؤں کے ایک ایسے ہوٹل پہ رکی جہاں سے پاکستانی کھانا تو کجا، ایک عدد اُردو جملے کی توقع بھی عبث تھی۔ زندگی میں پہلی اور آخری بار عربی خبسوں (بڑی بڑی خمیری روٹیاں) اور وہاں کی خالص قومی ڈشوں کے ساتھ سحری کی۔ بس سحری کا وقت ختم ہونے سے پہلے روانہ ہو گئی۔ اس لیے فجر کی نماز بس ہی میں ادا کی۔ سولہ نومبر کی صبح چھے بجے ہم اسلام کو آسانی اور وسعت عطا کرنے والے شہر یثرب، جو بعد میں مدینۃ النبی ﷺ کے اعزاز و لقب سے سرشار ہوا، کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔

مسجد نبوی ﷺ کے دلکش اور دیدہ زیب مینار دور سے نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ ان میناروں میں کوئی ایسی خاص کشش اور عظمت ہے کہ یہ یہاں کے ہر منظر بلکہ پورے ماحول پر چھائے ہوئے ہیں۔ بس نے ہمیں مسجد نبوی کے مین گیٹ ''باب الفہد'' کے قریب اتارا۔ ایک سرائیکی لہجے والا پاکستانی لپک کے آیا۔ اس نے ہماری ہوٹل کی ضرورت کو بھانپ لیا، اس لیے سائے کی طرح ہمارے ساتھ ہو لیا۔ مکہ اور مدینہ میں ہوٹل کے کاروبار میں ملتانی اور بنگالی لوگوں کا غلبہ ہے۔

دونوں میں فرق یہ ہے کہ بنگالی لوگ صفائی، ستھرائی اور کمائی میں ملتانیوں سے بہت آگے ہیں۔ یہ ملتانی بھائی کچھ اپنی مناتے، کچھ ہمارے مانتے ہمیں اپنے ہوٹل تک لے آیا۔ بھاؤ تاؤ کے بعد ہم کمرہ نمبر 102 میں مقیم ہو گئے۔ اس ہوٹل کا نام قصرِ مکۃ المکرّمہ تھا، کیسا اتفاق تھا کہ ہم بہ یک وقت مکہ اور مدینہ میں رہائش پذیر تھے۔

ہمارا ہوٹل مسجد نبوی سے پانچ منٹ کی پیدل سیر (Walk) کے فاصلے پر تھا۔ اس لیے تمام نمازیں بڑی سہولت کے ساتھ مسجد میں ادا ہوتی تھیں۔ مسجد نبوی کی وسعت اور آرائش براہ راست دلوں کو چھوتی ہے۔ قرونِ اولیٰ میں جتنے رقبے پر مدینہ شہر واقع تھا، اب وہ سب کا سب مسجدِ نبوی کے صحن میں سمٹ آیا ہے۔ مدینہ کے ماحول میں ایک فراخی، آسانی اور کشادگی ہے۔ گلے لگانے، اپنا لینے اور اپنا بنا لینے کی ایک ادا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ فراخی اور کشادگی ہمارے ہم وطنوں کے ذہنوں تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ وہ جس طرح کے تفرقانہ تعصّبات اپنے گلی محلے سے لے کے چلتے ہیں، آخر وقت تک ان پہ آنچ نہیں آنے دیتے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ یہاں آ کے کھلی آنکھوں اور کشادہ ذہن کے ساتھ دین و مذہب اور عبادت کی رسوم کا مشاہدہ کرتے اور ان کی روشنی میں اپنے اعمال و افعال کی تہذیب کرتے لیکن صاحب وہ تو فرقہ پرستی کی پٹاریوں میں بند ہو کے وہاں پہنچتے ہیں۔ مفاد پرست ملاؤں نے ان کی آنکھوں پر بریلویت اور وہابیت کے ایسے مضبوط کھوپے چڑھا دیئے ہیں کہ جن کے اندر سے اسلامی بھائی چارے کا وجود بھی دکھائی نہیں دیتا۔

ہمارے ہاں فرقہ پرستی کے جھگڑے اور بحثیں رفع یدین کرنے یا نہ کرنے، آمین بلند آواز میں کہنے، نہ کہنے، شلوار ٹخنوں سے اوپر یا نیچے، نمازِ ظہر ساڑھے بارہ یا ڈھائی بجے، نماز تراویح کی رکعتیں آٹھ یا بیس سے شروع ہو کر اللہ بمقابلہ رسول ﷺ کے خوف ناک مقام تک پہنچ چکے ہیں۔

مفاد پرست لوگ ایک دوسرے کو چڑانے، عوام الناس کو ورغلانے اور اپنے فرقے کی دھاک بٹھانے کی دھن میں اصل اور اصول سے بہت دور جا پڑے ہیں۔ یہ تمام فروعی اختلافات قرآن اور حدیث کے مطالعے اور دین کے اصل مقاصد پہ غور کرنے سے بہ آسانی ختم ہو سکتے تھے لیکن چونکہ اس سے بہت سے لوگوں کے دھندے پہ لات پڑنے کا خدشہ ہے، اس لیے لوگوں کو

www.urduchannel.in

قرآن کی طرف رجوع کرنے کی نہ صرف یہ کہ ترغیب نہیں دی گئی بلکہ اس سے دور رکھنے کی تمام ممکنہ کوششوں سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔ جمعہ کے خطبات میں ہمارے علما کو ایک دوسرے کو گالیاں دینے، مخالف فرقے کو کافر قرار دینے یا لچھے دار تقاریر اور لایعنی موضوعات پہ مغزماری کرنے سے فرصت ہوتی یا انھوں نے خود قرآن کی خوبصوریوں، حکمتوں اور دانائیوں کو کھلے دل، کھلے دماغ اور وسیع ظرف کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی ہوتی تو قرآن کی تفہیم کا حق بہتر طریقے سے ادا ہوسکتا تھا۔

ہماری سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ہم محض پیدائشی مسلمان ہیں، بہ برضا و رغبت نہیں۔ پیدا ہوتے ہی چونکہ کان میں اذان پڑھ دی گئی تھی اور گھر والوں نے محمد بوٹا، غلام رسول یا احمد علی وغیرہ نام رکھ دیا۔ ذرا ہوش سنبھالا تو سرکار سے نو سو روپے تنخواہ پانے (یاد رہے 2003ء میں کسی بھی عام مسجد میں امام کی تنخواہ کا تقریباً یہی تناسب تھا) یا محض روٹی روزی کی طلب میں نمازیں پڑھانے والے علمائے دین کے حوالے کر دیے گئے، اپنے منھ میاں، مولانا اور علامہ بننے والے ان علما نے ہماری کھوپڑیوں پر ذاتی مفاد پرستی اور تفرقہ بازی کا آہنی خول چڑھا کر روشن خیال مسلمان بنانے کی بجائے شاہ دولے کا چوہا بنا کے رکھ دیا۔

کسی بھی دین کی سب سے بنیادی شرط یہی ہے کہ توحید کی اہمیت اور عظمت کو پہچانا جائے اور شرک کی کسی بھی صورت سے ہر ممکن بچا جائے۔ اس دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے، اسی نقطے کی وضاحت کے لیے آئے لیکن کم عقل، ہٹ دھرم، حیلہ جو اور شکم پرور طبقے نے ہر دور میں شرک کی نئی سے نئی راہیں تراش لیں۔ کہیں اللہ کے مقابلے میں پتھر کے بت کھڑے کر دیے گئے، کہیں چاند، سورج اور آگ کو سب سے بڑی طاقتیں تسلیم کر لیا اور کبھی شاطر و عیار قسم کے لوگ دعائیں اور منتیں قبول کروانے میں اللہ تعالیٰ کی ٹھیکے داری کرنے پر مامور ہو گئے۔ مفاد پرست طبقے نے اس سلسلے میں سب سے خوفناک کام یہ کیا کہ اللہ کے پیارے رسول ﷺ کو اللہ کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ آپ سب جانتے ہیں کہ اس وقت نعتوں، قوالیوں میں کی جانے والی مشرکانہ شاعری، عوام کو گمراہ کرنے اور توحید سے بھٹکانے میں سب سے زیادہ خوف ناک کردار ادا کر رہی ہے۔ بھولے بھالے اور سادہ و معصوم عوام یہ بھی نہیں جان پاتے کہ جس کام کو وہ عین عبادت و عقیدت سمجھ کر رہے ہیں، وہی عمل انھیں حق و صداقت اور توحیدِ الٰہی سے دور کر رہا ہے۔

اس وقت حرمِ نبوی ﷺ بھی پاکستانی پیروں سے بھرا پڑا تھا۔ جو اپنے اپنے معتقدین کو مخصوص رنگوں کے لباس پہنا کے مدینے لے جاتے ہیں۔ وہاں کسی نہ کسی ستون کے اردگرد اپنا قبضہ یا آستانہ جما لیتے ہیں۔ خوش عقیدت مریدین یا غلام ابنِ غلام وہاں بھی انھیں بیٹھے بٹھائے ہر دنیاوی نعمت سے نوازتے ہیں۔ آنے جانے کا خرچ تو پہلے ہی مریدین باصفا کے ذمے ہوتا ہے۔ اس ساری خدمت اور معاوضے کے عوض پیر صاحب ان کی فرقہ وفتنہ پرور عادات و رسوم کی نگرانی کرتے ہوئے ان کی عقیدت کے پربھگوئے رکھتے ہیں۔ ایسے میں اذہان و قلوب کے دریچوں کو وا کرنے کی نہ ضرورت محسوس ہوتی ہے اور نہ ہی نوبت آنے پاتی ہے۔ بقول ڈاکٹر خورشید رضوی:

کبھی اپنی آنکھ سے زندگی پہ نظر نہ کی
وہی زاویے کہ جو عام تھے، مجھے کھا گئے

ایسی صورت میں تو کسی مرید کے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں پیدا ہونے پاتا کہ:

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

عہدِ حاضر کے مستند و معروف شاعر جناب شاہین عباس نے ایک زمانے میں ایسے ہی عقل کے اندھوں اور گانٹھ کے پوروں کو دوٹوک مشورہ دیا تھا کہ:

شب زادگاں! تم اہلِ خبر سے نہیں، سو تم
اپنا مدار، اپنا مدینہ جدا کرو!!

❁❁❁

0000

www.urduchannel.in

43

آنکھ میں رت جگے مدینے کے

رمضان المبارک کے آخری عشرے میں اگر مسجد نبوی کے کسی بھی اندرونی ستون کے آس پاس سے خراٹوں کی باجماعت آواز سنائی دے تو جان لیں کہ یہاں کوئی نہ کوئی پیر صاحب مریدوں کی نگرانی میں اعتکاف فرما رہے ہیں۔ ہمارے ایک دوست بیگم کی روز روز کی فرمائشوں، فہمائشوں اور آزمائشوں سے تنگ آ کر مسجد میں جا کر اعتکاف کی نیت سے فروکش ہو گئے۔ ان کے ننھے منے صاحب زادے کو اشتیاق ہوا کہ ذرا دیکھا جائے کہ اعتکاف پر کس طرح بیٹھتے ہیں؟ یہی شوق انھیں کشاں کشاں مسجد لے گیا۔ والد صاحب کے تخلیے میں چور نظروں سے جھانک کر دیکھا اور واپس آ کر ماں کو رپورٹ کی کہ:

''امی امی! ابو اعتکاف لیٹے ہوئے ہیں''

حرم کعبہ اور مسجد نبوی میں رمضان المبارک کے آخری عشرے کا معمول یہ ہے کہ نماز عشاء کے ساتھ نماز تراویح اور پھر رات ایک بجے سے تین بجے شبینہ ادا کی جاتی ہے۔ ہمارے مقامی گروپوں کا یہ معمول ہے کہ یہ مسجد نبوی کے کونوں کھدروں میں اپنے مقامی اماموں کے پیچھے شبینہ ادا کر لیتے ہیں اور جب اجتماعی طور پر شبینہ ادا کرنے کا وقت آتا ہے تو ان گروپوں کے درمیان خراٹوں کا ہا کی میچ ہو رہا ہوتا ہے۔

اپنے ہم وطنوں کے حوالے سے ایک بات ہماری سمجھ سے بالا رہی کہ یہ امامِ کعبہ یا امامِ مسجد نبوی کے پیچھے بھی نماز ادا کر رہے ہوں تو مرضی اپنی چلاتے ہیں۔ امام رفع یدین کرتا ہے، یہ نہیں کرتے۔ امام بلند آواز میں ''آمین'' کہتا ہے، یہ نہیں کہتے۔ امام وتروں میں ہاتھ اٹھا کے دعا مانگتا ہے، یہ نہیں مانگتے۔ امام نماز جنازہ میں ایک طرف سلام پھیرتا ہے، یہ عادتاً دونوں جانب سلام پھیرتے ہیں۔ ایسے میں اقتداء کہاں رہ جاتی ہے؟ لکیر کی فقیری کی حد یہ ہے کہ ایک روز امامِ حرمِ

کعبہ نے وتر کی نماز میں دعا نہیں مانگی۔ جس کا میرے خیال میں مطلب لوگوں کو یہ سمجھانا تھا کہ یہ نماز دعا مانگے بغیر بھی مکمل ہو جاتی ہے لیکن نماز ختم ہوتے ہی ہمارے پیچھے کھڑے دو مولوی حضرات میں سے ایک بولا:

''مولوی بھل گیا اے، وتر دوبارہ پڑھ لیں''

دوسرے مولوی صاحب کہنے لگے:

''میں تے پہلے وی وتر دوبارہ الگ توں پڑھناواں''

یہ کہہ کر دونوں حضرات نے دوبارہ وتر ادا کرنے شروع کر دیے اور مجھے روایت شکن شاعر میر تقی میر یاد آ گیا:

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ہم مسجدِ نبوی میں صدر دروازے (باب الفہد) کی طرف سے داخل ہوتے تھے۔ صدر دروازے کے عین سامنے ایک طرف طیبہ شیراتون (Shereton)، جامنی روشنیوں سے مزین مدینہ ہلتون (Hilton) اور الجنۃ طیبہ السکینہ جب کہ دوسری جانب الانصار ڈائمنڈ، دارالتقویٰ، انتر کونتی نینتال (Inter Continental) اور الاندلس سوٹس کی فلک بوس عمارات ایستادہ ہیں۔

مسجدِ نبوی میں صفائی قابل رشک اور اس کی کشادگی روح پرور ہے۔ مسجد میں واقع آنحضور ﷺ کے روضے کی زیارت دن رات جاری رہتی ہے۔ علاوہ ازیں روضۃ الجنہ میں نوافل کی ادائیگی کے لیے بھی رش رہتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ امامِ مسجدِ نبوی جناب ابو حذیفہ کے عین پیچھے جگہ پانے کے لیے مجھے نماز عصر سے ایک گھنٹہ قبل وہاں براجمان ہونا یا دوسرے معنوں میں دھرنا دینا پڑا تھا۔ یہ قبضہ مجھے ان کے طریقہ نماز کا بغور جائزہ لینے کے لیے اختیار کرنا پڑا۔ اس دوران مَیں نے مشاہدہ کیا کہ مسجد نبوی کے محراب میں 15 مائیکروفون مستقل قبضہ جمائے ہوئے تھے۔ ان میں سے آٹھ مائک جائے قیام پر، چھے رکوع کے مقام پر اور ایک سجدہ کی جگہ قالین پر سر ٹکائے پڑا ہے۔ دائیں ہاتھ ایک چھوٹا سا ریک ہے جس پر ''لطائف المعارف'' اور ''یسیر الکریم الرحمٰن'' نامی دو کتابیں سلیقے

www.urduchannel.in

سے دھری ہیں۔

مسجدِ نبوی سے مسجدِ قبا کی طرف نکلیں تو مسجد نبوی کی بیرونی دیوار کے آس پاس چھوٹی چھوٹی مساجد کافی تعداد میں موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ غزوہ احزاب میں جب لشکرِ کفار کو روکنے کے لیے خندق کھودی گئی تو جن جن مقامات پر صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کو تعینات کیا گیا انھیں مقامات پر بعد میں چھوٹی چھوٹی مساجد تعمیر کر دی گئیں۔ (یاد رہے کہ وہاں ان بزرگوں کے آستانے اور مزار نہیں، ان کی یاد میں مساجد تعمیر کی گئی ہیں) حرم نبوی کے بیرونی گیٹ نمبر 6 سے باہر نکلیں تو بائیں جانب ایک ایک ریال میں بکنے والی اشیا کے سٹالز ہیں اور دائیں جانب ایک درجن گنبدوں اور ایک مینار کے ساتھ کھڑی مختصر سی مسجد غمامہ ہے۔ غمامہ عربی زبان میں بادلوں کو کہا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ نبی معظم ﷺ نے اس مقام پر شدید گرمی میں بارش کی دعا مانگی تو دیکھتے ہی دیکھتے بادل گھر آئے۔ یہ اس نام کی مسجد اسی واقعے کی یادگار ہے۔

اس کے ساتھ ہی مسجد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، ایک گنبد اور ایک چھوٹے مینار کے ساتھ موجود ہے۔ یہ مسجد صدیوں پہلے پتھر اور لکڑیاں جوڑ کے تعمیر کی گئی تھی۔ آج کل یہ خستہ حالت میں ہے۔ اس مسجد کے مشرق میں چند قدموں پر مسجد علی رضی اللہ عنہ ابن طالب ہے۔ پھر ان تینوں مساجد سے مغرب کی جانب کوئی ایک فرلانگ کے فاصلے پر مسجد عمر رضی اللہ عنہ ابن الخطاب واقع ہے۔ پھر مسجد عثمان رضی اللہ عنہ جس کا دوسرا نام مسجد نور ہے، بائیں جانب واقع ہے جس پر بنگالی اہل حرفہ قابض ہیں۔ ان سب سے تھوڑا ہٹ کے مسجد بلال رضی اللہ عنہ اپنی شان و شوکت کے ساتھ موجود ہے۔ مسجد کے اردگرد اور زمینی منزل (Ground floor) پر ایک گول مارکیٹ وجود میں آچکی ہے۔ اس مارکیٹ کو سوقِ بلال المرکزی (بلال مارکیٹ) کا نام دیا گیا ہے۔ مارکیٹ میں زیادہ تر دکانیں کمبلوں اور قالینوں کی ہیں۔ یہ مسجد خاصی کشادہ اور جدید طرز تعمیر کا شاہکار ہے۔ اس کے قالین صاف ستھرے اور جملہ سامان میں ایک خاص سلیقہ اور ترتیب موجود ہے۔ ایک اونچا مینار ہے جو نیچے سے سفید اور اوپر سے سبز ہے۔ یہ مینار مسجد نبوی سے بھی دکھائی دیتا ہے۔ مذکورہ مسجد کے اردگرد دکانوں، مارکیٹوں اور چھوٹے چھوٹے مکانات پر بنگالیوں کا ایسا شدید قبضہ ہے کہ مسجد بلال پہ مسجد بنگال کا شائبہ ہوتا ہے۔

حجازِ مقدس میں مختلف مساجد کی زیارت بھی میرے شوق کا حصہ تھی۔ اصل میں تو یہ دینِ اسلام کے لگائے ہوئے پودے تھے جنھوں نے آغازِ اسلام ہی سے راہ خدا میں ہر دم رواں قافلوں کو چھاؤں اور آکسیجن فراہم کی۔ مدینہ النبی ﷺ میں آ کے ایک حسرت اس سلسلے میں لگائے گئے اولین پیڑ یعنی مسجد قبا کو دیکھنے کی بھی تھی۔ اس مسافت کو پیدل طے کرنے کی آرزو تھی لیکن بعض احباب نے سفر کی طوالت اور راستے کی اجنبیت سے ڈرایا۔ یہی وجہ ہے کہ جاتے ہوئے یہ سفر ٹیکسی میں طے کیا لیکن واپسی میں پاؤں پاؤں چلتے ہوئے مسجد نبوی ﷺ پہنچا۔ راستے میں تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے مسجدِ جمعہ اور مسجدِ بن لادن کے پاس بھی رکا۔ بن لادن کے حوالے سے بے شمار مقامات اور اشیا مدینہ کے آس پاس موجود ہیں۔ پتہ نہیں انھیں ابھی تک امریکا کی نظر کیوں نہیں لگی؟

پیدل واپسی میں نبی محترم ﷺ کے نقشِ قدم کی تلاش کا مقصد مستقل طور پر مضمر تھا۔ اگرچہ مستنصر حسین تارڑ کے مہماتی سفرناموں نے اجنبی راستوں کے دیگر فیوض و برکات سے بھی آگاہ کر رکھا ہے۔ پھر راستے میں پڑنے والے ماڈرن قسم کے شاپنگ سٹورز میں بھی جھانکنے کا اتفاق ہوا جہاں پلاسٹک کے زنانہ مجسمے نظروں کو قیدی بنانے کا فریضہ بہ حسن و خوبی ادا کر رہے تھے۔ اب ذرا تخیل کا چابک ہاتھ میں ہو تو ان مجسموں میں جان ڈالتے ہوئے دیر کتنی لگتی ہے؟ لیکن یہاں عقیدت کی رم جھم میں ہمارے تخیل کے پر مستقل طور پر بھیگ چکے تھے۔ مدینہ شہر کے بازاروں اور دکانوں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ہمارے جو زائرین وطنِ عزیز سے مدینے کی گلیوں میں موت کی تمنا کے نعرے لگاتے ہوئے جاتے ہیں وہاں نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ شاپنگ کرتے اور دنیاوی مسرتوں کے بُلّے لوٹتے پائے جاتے ہیں۔

❁❁❁

0000

www.urduchannel.in

شاہی مہمان

اٹھارہ نومبر کو نمازِ ظہر مسجدِ نبوی میں ادا کرنے کے بعد ہمارا چار رُکنی قافلہ ایک بار پھر بہ ذریعہ ٹیکسی مسجد قبا کے لیے روانہ ہوا۔ اسی روز مسجد قبا کے ساتھ وہ جگہ بھی ملاحظہ کی، جہاں کبھی جناب ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا مکان ہوا کرتا تھا اور جہاں ہجرتِ مدینہ کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی نے قیام کرنا گوارا کیا تھا۔ اب اس مقام پر ایک چبوترہ تعمیر کر دیا گیا ہے۔

اسی روز یعنی 23 رمضان کو شام کی افطاری پہ ہم شاہ فہد کے مہمان تھے۔ اتنا بڑا دسترخوان ہم نے زندگی میں پہلی بار ملاحظہ کیا۔ ویسے تو مسجد نبوی کے کونے کونے میں میزبانوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ہم نے اس سے قبل سن رکھا تھا کہ مہمان نوازی کی کوئی حد ہوتی ہے لیکن یہاں آ کے ملاحظہ کیا کہ دل داری و دل نوازی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ یہاں جس کو دیکھو خدمت پہ کمر بستہ ہے۔ کوئی جوس تقسیم کر رہا ہے، کوئی طرح طرح کی کھجوریں لے کے آیا ہے، کوئی دہی کے پیکٹ زائرین میں بانٹ رہا ہے، کوئی پستہ اور بادام لٹانے میں مگن ہے، کوئی آبِ زم زم کے گلاس لیے کھڑا ہے، کوئی حاجیوں کے راستے میں ٹشو پیپر کا ڈبہ لیے ایستادہ ہے۔ شاید یہ بتانے کے لیے کہ حضرت پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے۔

پھر شاہی میزبانی کا تو سلیقہ ہی سب سے جدا ہے۔ خادمین حرمین شریفین کی مطبوعہ واسکٹیں (Printed jackets) پہنے ملازمین کی ایک فوجِ ظفر موج ہے۔ ان میں سے کوئی قالین بچھا رہا ہے، کوئی دل بچھا رہا ہے، کوئی خود ہی بچھا جا رہا ہے۔ مہمانوں کو خوش آمدید کہہ کے بلکہ کہنا چاہیے کہ خوشامد کر کے دسترخوان پہ بٹھایا جا رہا ہے۔ کوئی ملازم لسی کی بوتلیں مہمانوں کے سامنے رکھ رہا ہے۔ کوئی بریانی اور بروسٹ کے گرما گرم پیکٹ لیے کھڑا ہے۔ کسی پیکٹ میں منرل واٹر اور زم زم کی بوتلیں اور مختلف جوسز کے ڈبے ہیں۔

ایک پیکٹ ایسا ہے کہ اس میں چمچ اور کانٹوں کے ساتھ ساتھ نمک، مرچ، مصالحہ جات حتیٰ کہ ٹوتھ پک الگ الگ پیک ہیں۔ حد یہ ہے کہ اسی پیکٹ کے اندر ایک پلاسٹک بیگ بھی موجود ہے کہ اگر کوئی مہمان بچا ہوا یا مکمل کھانا اپنے ساتھ بھی لے جانا چاہے تو بسم اللہ سبحان اللہ! اس دسترخوان پہ اپنے اردگرد دیکھ کے بزرگوں کا مقولہ سچ ہو کے سامنے آ گیا کہ:

''بنگالی کی زبان اور پنجابی کا ہاتھ ہلے بغیر نہیں رہ سکتے۔''

مسجد نبوی میں ایک سہولت یہ رہی کہ یہاں نماز جنوب کی طرف منہ کر کے پڑھی جاتی ہے، کیونکہ قبلہ اسی رخ پہ ہے۔ دل کو یہ تسلی رہی کہ چلو کوئی علاقہ ایسا ہے کہ جہاں مغرب کے سامنے نہیں جھکنا پڑتا۔

ہمارا ہوٹل چونکہ مسجد نبوی کے صدر دروازے (باب الفہد) کی طرف واقع تھا۔ اس لیے ہم عموماً مسجد کے اسی طرف والے حصے میں نماز ادا کرتے تھے۔ احباب نے بتایا کہ ان دنوں پاکستان کے معزول وزیراعظم میاں نواز شریف بھی اسی حصے میں نماز پڑھتے پائے جاتے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ہر طرف اتفاق انڈسٹریز کا بول بالا تھا۔ زیرِ تعمیر عمارات میں اتفاق کا لوہا استعمال ہوتا تھا جب کہ تعمیر شدہ عمارات میں ان کا لوہا مانا جاتا تھا۔ یہ لوگ زمین کے گز اور آسمان کے سورج بنے ہوئے تھے اور ان کے عہد میں صدارت و وزارت سمیت تمام اہم ترین عہدے سورج مکھی کے پھول کے کلاس فیلو تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پوری دنیا کہتی تھی:

منہ طرف کعبہ شریف تو ان کا سدھایا ہوا یا نوازا ہوا طبقہ کہتا تھا:

منہ طرف بابا شریف۔

کہا جاتا ہے کہ جب یہ لوگ بھارتی گاؤں جاتی عمرہ سے پاکستان وارد ہوئے تھے، ان کی کل جائیداد لوہے کی ایک بھٹی پر مشتمل تھی۔ کاروباری دانائی، چترائی اور زمانہ سازی سے آشنائی کی بنا پر ہوتے ہوتے وہ بھٹی ایک ایسے بھٹیار خانے کی شکل اختیار کرتی چلی گئی، جس میں قطرے کے دریا، ذرے کے صحرا اور تنکے کے گلستاں بننے کا تماشا کھلی آنکھوں سے ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا دوٹوک فیصلہ ہے کہ وہ کسی کو بے پناہ دولت دے کے آزماتا ہے، تو کسی سے سب کچھ چھین کر۔ انسان ایسا ناشکرا اور جلد باز ہے کہ دونوں صورتوں میں آپے سے

www.urduchannel.in

باہر ہو جاتا ہے۔ اسی خاندان کو ایک زمانے میں اللہ تعالیٰ نے ایسا عروج عطا کیا کہ جس کی کوئی مثال ہماری ملکی تاریخ میں ملنا محال ہے۔ اس زمانے میں (جب کہ انھوں نے کشکول توڑنے کا نعرہ بھی لگایا تھا) اگر یہ اسی ملک کی رگوں سے کشید کی گئی دولت میں سے آدھی دولت بھی ملکی قرضوں کے لیے وقف کر دیتے تو نہ صرف یہ کہ ملک قرضوں سے آزاد ہو جاتا بلکہ یہ خاندان اس طرح سے لوگوں کے دلوں میں بس جاتا کہ یہ سات نسلوں تک بھی حکومت کرتے رہتے تو لوگ ان کو سر آنکھوں پہ بٹھاتے لیکن مزید، کی ہوس نے موجود کا شکر ادا کرنے سے روکے رکھا اور پھر.....

پھر ایک شدید جھٹکا..... کیسی انوکھی بات ہے کہ جس سرزمین پہ جانے کو لوگ انعام، کرم نوازی اور عطیۂ خداوندی خیال کرتے ہیں، وہاں ان کو سزا کے طور پر بھیجا جاتا ہے..... پھر اس حیران کُن سزا پہ بھی سجدۂ شکر ادا کیا جا سکتا تھا لیکن لندن اور امریکا کی ہوس نے نہیں کرنے دیا..... ویسے بھی اس کے لیے توفیق کہاں سے آتی؟

یہاں سزا کا ایک اور انداز ملاحظہ ہو، کہ ان کے والدِ بزرگوار کو اس دھرتی پہ موت آ گئی جہاں مرنا وار دفن ہونا دنیا بھر کے ہر مسلمان کی سب سے بڑی خواہش ہو سکتی ہے..... بزرگوار کی خانہ کعبہ میں نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے لیکن مزید کی خواہش اور دنیاداری کی ہوس نے یہاں بھی شکر ادا کرنے سے روکے رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ والد کی میت ناشکری اور سیاست کی ارتھی پہ رکھ کے لاہور بھجوا دی گئی۔ خانہ کعبہ کے بعد ایک مزار پہ سیاسی نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے اور جنت البقیع کی بجائے رائیونڈ روڈ کے جعلی جاتی عمرہ میں قبر نصیب ہوتی ہے:

کتنا ہے بد نصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمیں نہ ملی کوئے یار میں

یہاں ہمارے دل میں ایک آدھ بار یہ خواہش بھی جاگی کہ ڈھونڈ ڈھانڈ کے ماضی میں بھاری مینڈیٹ پہ اِترانے والے اس بدقسمت بادشاہ کی موجودہ سبک سری بھی ملاحظہ کی جائے لیکن یہاں جس تاجدارِ عالم ﷺ کی محبت اور کشش کھینچ کے لائی تھی، اس نے دنیاداروں کا تماشا دیکھنے کی طرف طبیعت راغب نہیں ہونے دی..... لیکن اس خاندان کی ژولیدہ طالعی ملاحظہ ہو کہ یہ اسی دھرتی پہ دل و جان بلکہ زندگی نچھاور کرنے کی بجائے کل عالم کا تماشا بننے کے لیے ازلی تماشا

بینوں کے دیس میں جا بسا:

تعز من تشاء و تذل من تشاء بیدک الخیر

مختصر یہ کہ انیس اور بیس نومبر کے دن بھی روضہ اطہر ﷺ حاضری دیتے اور شہر نبی ﷺ کی گلیوں بازاروں کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے میں بسر ہوئے۔ اکیس نومبر کو چھبیسواں روزہ اور جمعۃ الوداع تھا۔ رمضان المبارک کا یہ چوتھا اور آخری جمعہ مسجد نبوی میں امام ابوحذیفہ کی امامت میں پڑھا۔ رات کو ستائیسویں بھی تھی، جو مسجد نبوی ہی میں بسر ہوئی۔ اس رات عشاء کی نماز مسجد نبوی میں واقع روضۃ الجنہ میں ادا کرنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ تلاوت اور شبینہ کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ روضہ رسول ﷺ پہ قوم و ملک کی حالت زار کا بیان بھی اشک آلود موسم میں رواں تھا۔ لبِ لباب حالی کے اس شعر کا سا تھا:

فریاد ہے اے کشتیِ امت کے نگہبان!
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے!!

ستائیس رمضان کو فجر کی نماز کے بعد یہ چار رُکنی قافلہ واپس مکہ کے لیے روانہ ہو گیا۔

❁❁❁

www.urduchannel.in

47

بکہ بکہ بکہ

ہفتہ ۲۲ نومبر ستائیسویں رمضان کو فجر کی نماز مسجدِ نبوی میں ادا کرنے کے بعد ہم نے رختِ سفر باندھنا شروع کیا۔ مدینہ کے مکہ ہوٹل میں چھے دن قیام کا ۳۶۰ ریال بل ادا کیا۔ سولہ کا پہاڑا بھول چکا تھا اس لیے زیادہ دکھ نہیں ہوا۔ شہرِ نبی ﷺ میں گزارے یہ سات دن نہایت پُر کیف تھے۔ اسلام اور اہلِ اسلام کو سب سے پہلے سینے سے لگانے والے اس شہر کا ایک منظر آج بھی دلوں کو حلاوت اور نظروں کو طراوت بخشتا ہے۔ بادشاہ کے ساتھ ساتھ وہاں کے لوگوں کی میزبانی بھی دلوں سے پھوٹتی محسوس ہوتی ہے۔ رمضان المبارک میں لگتا ہے پورا مدینہ اپنی تمام جمع پونجی کو آخرت کی پونجی میں تبدیل کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ لوگ اپنے مہمانوں کا ہر نخرہ، ہر غمزہ اٹھانے کو تیار ملتے ہیں۔ وہ انھیں پکڑ پکڑ کے دسترخوانوں پر بٹھانے ناز و نعم کے ساتھ کھلانے اور اُن کا من پر جانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

مدینہ ہر وقت ٹرانسپورٹرز کی بکہ بکہ (جگہ کا مقامی تلفظ) کی آواز سے گونجتا رہتا ہے اور قافلے صبح شام مکہ، مدینہ اور جدہ کی طرف رواں دواں رہتے ہیں۔ یہی قافلے ہی اس ملک کی معیشت، معاشرت، استقامت اور اعتماد کے کفیل ہیں۔ مدینہ کے بس سٹینڈ پر قطار اندر قطار کھڑی لگژری اور نئی نکور بسوں پہ زیادہ غور نہ کریں تو یہاں بھی روایتی لاری اڈوں جیسا ماحول ہے۔ عرب کنڈیکٹر سواریوں کو دیکھتے ہی بکہ بکہ بکہ کی آوازیں لگانا شروع کر دیتے ہیں۔ بس کو بھرنے کے لیے طرح طرح کے تاخیری حربے استعمال کرتے ہیں۔ ہم جس بس میں سوار ہوئے، انھوں نے سواریاں اکٹھی کرنے کے لیے مدینہ کے مختلف بازاروں، سڑکوں کے چکر لگانے شروع کر دیے۔ عام حالات میں یہ پریشان ہونے والی بات ہوتی لیکن ہمارے لیے تو اس تاخیر کی تاثیر بہت روح افزا تھی۔ یعنی ہم نے بیٹھے بٹھائے پورے مدینے کی سیر کر لی۔ بقول سلیم احمد:

دنیا کی سیر بھی انھی راہوں میں ہو گئی
حالانکہ میں نے تجھ سے تجھی تک سفر کیا

کوئی دس بجے کے قریب ہمارا یہ قافلہ مدینے سے نکلا۔ مدینہ میں قیام کے دوران ہم نے مقاماتِ مقدسہ کے ساتھ ساتھ وہ جگہ بھی دیکھی جو پاکستانیوں کے لیے سب سے زیادہ پُرکشش ہے۔ یہ جگہ بابِ فہد سے شمال مشرق کی جانب واقع ہے، جہاں پاکستانی کھانے اور خاص طور پر اعلیٰ پائے کے پائے تیار کیے جاتے ہیں، ساتھ میں سبز چائے کا بھی اہتمام ہوتا ہے۔ یہ دعوتِ عام بعض پاکستانی مخیّر حضرات کی جانب سے اپنے پاکستانی بہنوں بھائیوں کے لیے ہوتی ہے۔

مدینہ کی حدود سے نکلتے ہی جلد ہمارا اگلا پڑاؤ وہ مسجد تھی، جہاں سے احرام وغیرہ باندھ کر عمرے کی تیاری یا نیت کی جاتی ہے۔ اس جگہ کو میقات کہا جاتا ہے، اگر ''اوقات'' بھی کہا جاتا تھا تو بہت مناسب تھا کیونکہ یہاں سے بندہ دنیاوی لباس اتار کے پھر دو سفید چادروں یعنی اپنی اصل اوقات میں آ جاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس پیرہن کی غرض و غایت بھی یہی ہے کہ فطرت اور سادگی سے ہر پل دور ہوتے اس شخص کو احساس دلایا جائے کہ اصل حسن، خوبصورتی اور سہولت تکلفات و مکروہاتِ دنیا سے ذرا فاصلے پہ رہنے ہی میں ہے۔ بیدل حیدری کا کیا خوبصورت شعر ہے:

بیدل لباسِ زیست بڑا دیدہ زیب تھا
اور ہم نے اس لباس کو اُلٹا پہن لیا

سو ہم نے بھی اس مقام پہ پہنچ کر غسل کیا، احرام باندھا، دو نفل ادا کیے اور پھر سے عازمِ مکہ ہوئے۔ راستے میں ایک گاؤں کے قریب بس روک کر باجماعت دوگانہ نمازِ ظہر اور عصر ادا کی۔ اردگرد کے مناظر پہ نظر کی تو جھلسی ہوئی زمین اور بپھری ہوئی لُو کے سوا کچھ سجھائی نہ دیا۔ موسم کی حِدت اور گرمی کی شدت ایسی کہ بڑی بڑی جناتی بسیں بھی ہانپنے لگتی ہیں۔ سوچنے لگا کہ قدرت نے اس جلتی بلتی دھرتی پہ کیسا کرم کیا کہ صدیوں سے پوری دنیا کے لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔

مغرب سے کچھ دیر پہلے ہم بیت اللہ میں واپس پہنچے۔ مکہ اس وقت انسانوں کی کثرت سے

www.urduchannel.in

چھلکا پڑتا تھا۔ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں پورے سعودیہ کے تعلیمی، سرکاری اور نجی اداروں میں تعطیلات ہوجاتی ہیں اور پھر اگلے دس دن، عرب وعجم کا یہ عظیم الشان اجتماع دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اتنے بڑے اجتماع کے لیے رہائش، کھانے اور دیگر سہولتوں کا نہایت احسن انداز میں انتظام وانصرام دیکھ کے وہاں کی انتظامیہ کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ مسجد الحرام میں افطاری، نمازِ مغرب وعشا وتراویح ادا کرنے کے بعد والدہ محترمہ کے ہمراہ خانۂ خدا کا طواف کیا، پھر سعیِ صفا ومروہ سے سرخرو ہوئے۔ زندگی میں دوسری بار سر منڈایا، جس پر وہاں صرف رحمتوں کے اولے ہی پڑ سکتے تھے۔ اس طرح اللہ کے فضل وکرم سے رات ساڑھے بارہ بجے ہمارا دوسرا عمرہ بھی مکمل ہوگیا۔

۲۳ نومبر کا سارا دن حرم میں گزرا، جملہ نمازیں امام کعبہ کی اقتدا میں ادا ہوئیں۔ چار پاروں کی تلاوت ہوئی، رات کو شبینہ کے پُر کیف مرحلے سے گزرے۔ آج آخری شبیہ بتایا جا رہا تھا کیونکہ اگلے دن انتیسویں اور آخری روزے کا اعلان ہو چکا تھا۔ یہاں روزوں اور عیدوں کے معاملات میں قیاس آرائیاں نہیں چلتیں، سرکاری وظیفہ خواروں کے نخرے برداشت نہیں کیے جاتے، لوگوں کو کئی کئی گھنٹے ٹی وی سکرین کے سامنے کومے میں نہیں رکھا جاتا بلکہ سائنس اور مستند علما کی مدد سے بروقت اعلانات ہوجاتے ہیں۔

اٹھائیسویں روزے کو ظہر تک مکہ شدید گرمی کی لپیٹ میں تھا کہ اچانک بادل اُمڈ کے آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف جل تھل ہوگیا۔ حرم میں بھی شام تک بارش ہوتی رہی۔ دس رمضان کے بعد یہ دوسری بڑی بارش تھی اور مکہ کی تاریخ میں اتنی جلدی اور کثرت سے بارش کا ہونا کوئی عام واقعہ نہ تھا۔ آخری روز بھی تقریباً سارا دن بوندا باندی جاری رہی۔ دوہری پھوار میں ہر نماز کے بعد خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ ہر نماز کے بعد ایک پارے کی تلاوت کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ رمضان کے پورے مہینے طواف کا عمل شدت اختیار کر جاتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کسی قریبی سے قریبی عزیز کے گھر اتفاق سے ہی جلد جلد دو چار چکر لگ جائیں تو وہ یقیناً زچ ہوجائے گا لیکن اس بہت بڑے ظرف اور شرف والے سوہنے رب کے صدقے جایئے کہ اس کے گھر کے اطراف میں سارا سال، پوری دنیا سے آئے ہوئے لوگ جتنے زیادہ چکر لگائیں ان پر اُسے ٹوٹ کے پیار آتا ہے۔

زیادہ تر زائرین عید الفطر سے قبل گھروں کو لوٹ چکے تھے، اس لے حرم میں خاص فراغت اور فراخی در آئی تھی لیکن طواف اور تکبیروں کی ادائی میں وہی گرما گرمی تھی۔

۲۵ نومبر ۲۰۰۳ء بروز منگل سعودیہ میں عید الفطر کا دن ہے۔ لاکھوں لوگوں کی طرح عید کی نماز ہم نے بھی مسجد الحرام میں ادا کی۔ یہاں فجر کی نماز کے بعد لوگ حرم میں بیٹھے رہتے ہیں اور تقریباً چھے بجے بلند آواز میں تکبیریں پڑھنا شروع ہوجاتے ہیں۔ ایک گھنٹہ تک دونوں امام اور پورا مجمع تکبیریں پڑھتا رہا۔ بڑا روح پرور منظر تھا۔ تکبیر تو اصل میں اللہ کے بڑے پن کو تسلیم کرنے کا قلبی وعملی اظہار ہے۔ سات بجے امام صاحب نے بارہ تکبیروں کے ساتھ عید کی نماز پڑھائی۔ پہلی رکعت میں سبحانک اللہ کے بعد سات تکبیریں پڑھی گئیں اور دوسری رکعت میں سورہ فاتحہ سے قبل پانچ مزید تکبیریں ادا ہوئیں۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ عربی میں خطبہ ہوا۔ خطبے کا اغلب حصہ، اسلام میں فرقہ پرستی کی مذمت پر مشتمل تھا۔ امام صاحب نے فرمایا کہ دین میں فرقہ بازی کا آغاز اسلام کی بنیادیں مضبوط کرنے کے لیے نہیں بلکہ اس کی جڑیں کاٹنے کے لیے ہوا۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے فرقوں کا راگ الاپنے اور فروعی اختلافات کو ہوا دینے کے بجائے قرآن اور سنتِ رسول ﷺ سے رجوع کریں۔

عید کے روز بھی مکہ کا موسم ابر آلود تھا۔ ہم کیا خود مکہ کے لوگ حیران تھے کہ یہاں کے موسم نے کون سی ادا سیکھ لی ہے؟ یہ چلچلاتی دھوپ، سرمگیں بادلوں کے حق میں دست بردار کیسے ہوگئی؟ سنگ ریزوں کی وادی سے سال ہا سال روٹھی رہنے والی گھٹائیں اچانک اتنی مہربان کیسے ہوگئیں؟ نمازِ عید، ظہر، عصر، مغرب سب کی سب خوشگوار پھوار میں ادا ہوئیں۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ عید کا پورا دن کعبہ کو دل میں بساتے، خوش رنگ نظاروں سے دل کو بہلاتے نیز اندر اور باہر برستی پھوار کا لطف اٹھاتے گزرا۔

اب روایتی عبادت اور رمضان المبارک کی سعادت کے مزے لوٹنے کے بعد کچھ فرصت و فراغت میسر آئی تو مکہ شہر کے جغرافیائی حسن سے متمع ہونے کی تمنا نے انگڑائی لی۔ چنانچہ عید کے اگلے ہی روز ہم نے گھومتے گھماتے ظہر کی نماز کے لیے شارعِ منصور پہ واقع ایک مقامی مسجد کا رُخ کیا۔ مسجد نہایت سلیقے سے تعمیر کی ہوئی تھی، جس میں ایک کشادگی اور فراخی کا احساس ہوتا تھا۔ فرش

www.urduchannel.in

پر دیدہ زیب قالین ہماری نظروں کی مانند بچھا جا رہا تھا۔محراب بالکل چھوٹی اور سادہ سی، دیواروں پہ شیشے نہ ٹائلیں، نہ لشٹم نہ پشٹم، نہ اونچے لمبے مینار، نہ وضو خانے کے پاس چندے کا بکس، لاؤڈ سپیکر ضرور ہے لیکن اذان کے علاوہ کوئی آواز باہر نہیں جاتی، ہر مسجد کے اوپر ایک چھوٹی سی بُرجی ہے جو مسجد کی عمارت کو دیگر تعمیرات سے ممیّز کرتی ہے۔لگتا ہے انھیں مسجد کا ٹوہر ٹپا بنانے کا طریقہ ہی نہیں آتا۔ پورے مکہ میں نماز کا ایک ہی وقت ہے۔امام نے خود ہی تکبیر پڑھنا شروع کی تو کونوں کھدروں سے کالے گورے، مزدور، تاجر، مسافر لوگوں کی ڈیڑھ قطار وجود میں آ گئی۔ پتہ چلا کہ زیادہ مجمع اس لیے نہیں ہے کہ زیادہ تر لوگوں کی خواہش اور کوشش حرم میں نماز ادا کرنے کی ہوتی ہے۔

اسی شام نمازِ عشا کے بعد شعبِ عامر میں واقع ہوٹل ''دارلشکر'' میں ایک دوست کو ملنے گیا۔ واپسی رات گیارہ بجے کے قریب ہوئی۔ راستے میں کیا دیکھا کہ بعض لبنانی تاجرائیں فٹ پاتھ کے اوپر سامان بلکہ بے سروسامانی بکھیرے بیٹھی تھیں۔ان میں ایک قتالہ تو ایسی تھی کہ کسی چیز کا بھی ریٹ بتاتی تو بہ قول یوسفی: روپیہ ہاتھ کا میل محسوس ہونے لگتا۔اس نے ہر چیز کے داموں کے استفسار پر نرم شگفتہ لہجے میں ''عشرہ ریال'' کہنے کی قسم کھائی ہوئی تھی۔ہم نے کسی چیز پر سودے بازی کے موڈ میں اپنی جملہ عربی کو پاؤں پر کھڑا کرتے ہوئے ''خمسہ ریال'' کی آواز لگائی تو اس نے اسی شیریں مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

''خمسہ معافی!''

اس وقت ہمارے اندر ایک شاعر کی روح حلول کرنے ہی والی تھی کہ اپنے اس سفر کی غرض وغایت یاد آ گئی۔ چنانچہ مسافر اس تاجر حسینہ پہ شاعرانہ نظر ڈالنے کی بجائے، مکتبہ مکہ مکرمہ اور شاہی محلات پہ طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے باب مروہ کے راستے حرم میں داخل ہو گیا۔

❁❁❁

0000

کبھی اے حقیقتِ منتظر

شاعرِ مشرق نے جانے کس کیفیت میں عشقِ حقیقی کی اس انتہائی طلب کو نظم کیا تھا کہ:

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبینِ نیاز میں

لیکن آج کم از کم مجھے تو یہی احساس ہوا کہ حقیقتِ منتظر، لباسِ مجاز میں میرے سامنے ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ آج میں تہجد کے نوافل ادا کرنے کے بعد طوافِ بیت اللہ کر رہا تھا کہ فجر کی نماز کا وقت ہو گیا۔طواف کرتے کرتے حسبِ روایت نماز کے لیے قطاریں بننا شروع ہو گئیں۔اتفاق سے مجھے جو جگہ نصیب ہوئی وہ خانہ کعبہ کے بالکل ساتھ پہلی صف میں تھی۔صورت کچھ یوں تھی کہ امام صاحب مقام ابراہیم علیہ السلام کی طرف تھے اور ہم ان کے بالکل سامنے رُکنِ یمانی کی جانب۔گویا ہمارے اور امامِ محترم کے درمیان حقیقتِ منتظر (خانہ کعبہ) ایستادہ تھا۔یہاں کھڑے کھڑے اور منہ ہی منہ میں نیت باندھتے ہوئے ایک روایتی اور رٹا رٹایا جملہ منہ سے ادا ہو:

''پیچھے ایس امام دے، منہ طرف کعبہ شریف''

تو اچانک احساس ہوا کہ یہاں منہ تو واقعی کعبہ شریف کی طرف تھا بلکہ یہاں تو سجدے کے وقت پیشانی بھی کعبے کی چوکھٹ سے ٹکراتی تھی۔یعنی یہاں صورت کچھ یوں تھی کہ ہم امام کی اِقتدا میں ہونے کے باوجود، امام کے پیچھے نہ تھے بلکہ سامنے تھے۔ایک خیال فوری ذہن میں آیا کہ اب اس روایتی نیت کی کیا صورت ہو گی؟ سامنے ایس امام دے یا دوسری طرف اس امام کے!!!

جب موسم کچھ بارش زدہ ہوتا تو امام صاحب ''باب الصفا'' پہ کھڑے ہو کے امامت کرواتے اور ہزاروں لوگ امام اور کعبے کے درمیان حائل ہوتے تو خیال آتا کہ اس وقت کیا کہا جائے گا؟

''آگے اس امام کے!!!''

❁❁❁

www.urduchannel.in

50

0000

زبانِ یارِ من عربی.....

پورا ایک مہینہ عربی ماحول میں رہتے رہتے، خُبسے اور تمر کھاتے، گہوہ اور شائے پیتے، ہر دکان پر خمسہ، عشرہ، ریالے کی گردان کرتے کرتے ہمارے اوپر عربی کی اتنی تہہ تو بہر حال چڑھ گئی تھی کہ ہم خود بخود ثلاثی کو تلاتی، وضو کو وُدو، پُل کو کُبری، راستے کو طریق اور سینڈوچ کو سینڈوش کہنے لگ گئے تھے۔ پانی ''مویا'' دودھ ''حلیب'' اور پیشاب ''میا'' کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ حاجی، حجہ، خلاص، انت معافی، معافی مشکل، صدیق، کم نفر، اِتی مجنون، دخول، خروج کو ادا کرنے میں تو گویا ہم اہلِ زبان کو بھی پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ ہم نے تو اپنے اہلِ سنت بھائیوں کو یہ مژدہ سنانے کا بھی عہد کیا تھا کہ عرب لوگ بھی کثرت سے ''یا محمد'' کہتے ہیں۔ یہ عقدہ بعد میں کھلا کہ وہ ہر مسلمان بھائی کے لیے اس طرزِ تخاطب کو پسند کرتے ہیں۔ لفظ ''محمد'' چونکہ تعریف کا انتہائی درجہ ہے۔ اس لیے وہاں کسی کے لیے خلوص کی انتہا یہ ہے کہ اسے ''یا محمد'' کے اعزاز سے پکارا جائے۔

کچھ ہی عرصے بعد ہم پہ یہ کھلا کہ ہماری عربی دانی کا منتر محض پاکستانی مخلوق پر اثر کرتا تھا۔ ورنہ مقامی عربوں کے درمیان ہماری تقریباً بند ہو جاتی اور ان کے اپنے بھائی بندوں سے گفتگو کرتے وقت عربی زبان کے ایسے فوارے چلتے کہ ہم عجمی سوائے ان کا منھ دیکھنے کے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ عربی بولتے ہوئے آواز بالعموم حلق سے برآمد کرتے ہیں۔ بعض اہلِ زبان کی نستعلیقیت اور تلفظ دیکھا تو لگتا تھا کہ حلق کے پاؤں پڑ رہے ہیں۔ خاص طور پر عرب لڑکیاں جب آپس میں روانی سے گفتگو کر رہی ہوتیں تو یوں محسوس ہوتا کہ وہ بول نہیں رہیں بلکہ زبان کے غرارے کر رہی ہیں۔

اپنی طرف سے تو ہم اپنے پاکستانی بھائیوں پر اپنی عربی دانی کی دھاک بٹھائے پھرتے تھے، وہی اندھوں میں کانا راجا والا حساب تھا کہ ایک روز والدۂ محترمہ نے دارلشکر ہوٹل کے کمرہ نمبر

تین میں بیٹھے بیٹھے ایسے ہی رواروی میں پوچھ لیا:

''پُتر اج مگھر دی کیہ تریخ اے؟'' (بیٹا آج دیسی مہینے مگھر کی کیا تاریخ ہے؟

یقین کریں ہمارا سارا علم اور مبینہ عربی دھری کی دھری رہ گئی۔ ہم نے بہتیرا نومبر کی اٹھائیس اور شوال کی پانچ کا راگ الاپا بلکہ جوشِ علم میں ہجری کا سن ۱۴۲۴ھ بھی منھ سے نکل گیا لیکن جب ان پہ ہمارے تقویمی علم کا ذرا بھی رعب پڑتا دکھائی نہ دیا تو ہم نے مگھر کے بجائے، عرب سمندر اور ملکی سیاست میں موجود بڑے بڑے مگرمچھوں کے قصے سنا کے اصل موضوع کی طرف سے ان کا دھیان ہٹا دیا۔

❁❁❁

www.urduchannel.in

51

0000

کبوتر اور بلیاں

آپس کی بات ہے کہ ہمیں زندگی میں نہ کبھی بلیاں اور کبوتر پالنے کا کوئی تجربہ ہوا، نہ ان کے لاڈ لڈانے کا شوق لیکن سعودی عرب میں حرم کے باہر بلیوں کی سیر چشمی اور شکم پُری کے مناظر اکثر دیکھنے میں آئے۔ شیخ سعدی کے اسپِ تازی کے مانند یہ موٹی تازی بلیاں کھانے پینے کی اشیا کی کثرت کی وجہ سے دنیا و مافیہا سے ایسی بے نیاز کہ انھیں دیکھ کے بے ساختہ میر کا یہ شعر یاد آجاتا:

فردوس کو بھی آنکھ اٹھا دیکھتے نہیں
کس درجہ سیر چشم ہیں کوئے بتاں کے لوگ

ان کو آپ مرغوب غذائیں دکھا کے جتنا مرضی للچائیں، پچکاریں، یہ آپ کی طرف راغب نہیں ہوں گی۔ حتیٰ کہ یہ تو سوتے میں بھی لگتا ہے کہ چھیچھڑوں کے بجائے ہاجمولا کے خواب دیکھتی ہوں گی۔ حرم کے کبوتروں سے تو ان کی باقاعدہ قلمی دوستی ہے۔ کوئی کبوتر خواہ آنکھیں بند کر کے ان کے راستے میں بیٹھا رہے، کوئی شریر چوہا چاہے سوئی بلی کی دُم پہ پاؤں رکھ دے، یہ پلٹ کے یہ تک پوچھنا بھی گوارا نہیں کرتیں کہ:

بتا تیری رضا کیا ہے؟

❁❁❁

سامان سو برس کا.....

جیسے جیسے زائرین کی واپسی کے دن قریب آنا شروع ہوتے ہیں، ان کے بیگ، گٹھڑیاں اور شاپر حاملہ ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان میں کمزور دل تھیلے اور شاپر کثرتِ استعمال کی بنا پر وہیں پھٹ جاتے ہیں اور بعض کی زچگی پاکستان پہنچ کے عمل میں آتی ہے۔ وہ بوڑھے جو وطنِ عزیز میں گڑگڑا گڑگڑا کے مدینہ میں دفن ہونے کی دعائیں کرتے ہیں، یہاں وہ پوری تن دہی سے کھجوروں کے ڈبے، تسبیحوں کے پیکٹ اور جائے نمازوں کے تھدّے ٹھونس ٹھونس کے اپنے بیگوں اور اٹیچی کیسوں کی توند بڑھانے میں لگے ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کو پاکستان پہنچ کے علم ہوتا ہے کہ چائنہ کی جو چیزیں وہ جوشِ عقیدت میں کڑے کوسوں سے اٹھا لائے ہیں، ہو بہو ویسی ہی اشیا، اپنے دیس میں آدھی قیمت پر دستیاب ہیں تو ان کے ثواب کا مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔

❁❁❁

www.urduchannel.in

دارالغنام

ستائیس نومبر کو جب واپسی کی ٹکٹیں کنفرم نہ ہونے کا علم ہوا تو ہم نے اگلے ایک ہفتے کے قیام اور والدہ محترمہ کی سہولت کے پیشِ نظر بابِ مدینہ کے عین سامنے شامیہ محلے میں واقع ''دارالغنام'' ہوٹل میں ایک کشادہ اور صاف ستھرا کمرہ تیس روپے ریال فی یوم کے حساب سے کرائے پہ لے لیا۔ کمرہ حرم پاک سے اتنا قریب تھا کہ یہاں سے وضو کر کے ڈیڑھ دو منٹ میں جماعت کے ساتھ شامل ہوا جا سکتا تھا۔ ہر طرح کی شاپنگ کے لیے دکانیں بے حد قریب تھیں۔ منی ایکسچینج کا دفتر چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ پاکستانی کھانوں والے ہوٹل تو گویا سرہانے دھرے تھے۔ حرم کی اِس قربت اور اشیا کی سہولت سے دستیابی سے اتنا کرم ہوا کہ والدہ محترمہ ہر نماز میں خود چل کے شریک ہونے لگیں۔ وہ ہر باجماعت نماز کے بعد نہایت باقاعدگی اور سہولت کے ساتھ خانۂ خدا کا طواف کرتیں اور جب جی چاہتا، خود ہی کمرے میں لوٹ آتیں۔

❁❁❁

0000

مٹی کی محبت میں.....

سعودی عرب کی سرزمین پہ قدم رکھے ایک مہینہ ہو چکا تھا لیکن یہاں مٹی کا نام ونشان نظر نہ آیا۔ ہم نے جگہ جگہ کچی زمین یا خالص گرد وغبار ڈھونڈنے کی بہتیری کوشش کی لیکن ہر بار پتھروں سے سر پھوڑنا پڑا۔ پکی سڑکیں، مضبوط پلازے، سب پہاڑوں کا سینہ کاٹ کے تعمیر کیا گیا ہے۔ ہمیں سمجھ نہ آئی کہ یہ لوگ اپنی مٹی سے محبت کیسے کرتے ہوں گے؟ ہمارے ہاں تو سڑکوں بازاروں میں خاکروبوں کے ذریعے اور اسمبلی ہالوں میں سیاست دانوں کے ذریعے خاک اڑا کے لوگوں کو اس سے محبت کا موقع دیا جاتا ہے۔

وہاں ہمیں عرفات کے میدان اور مکہ مدینہ کی سڑکوں پر نیم کے درخت نظر آئے تو پتہ چلا کہ یہ درخت جب مرحوم ضیاء الحق نے سعودی حکومت کو تحفۃً بھجوائے تو ان کے نصب کرنے اور پھلنے پھولنے کے لیے ساتھ پاکستانی مٹی بھی ارسال کی۔ وہاں مٹی کی اس قدر قلت دیکھ کے حکیم جی کہنے لگے کہ اگر اپنے افتخار عارف پاکستان کی بجائے سعودیہ میں ہوتے تو انھیں نہ جانے اپنے اس شعر کو مقبول عام بنانے کے لیے مٹی کی جگہ کون سا لفظ استعمال کرنا پڑتا:

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں کہ واجب بھی نہیں تھے

۲۹ اور ۳۰ نومبر کو شیخوپورہ میں ہمارے ایک قریبی عزیز کی شادی تھی، ہم مکہ سے محبت اور ان عزیزوں کی عجلت کی بنا پر اس میں شریک نہ ہو سکے۔ بہ ہر حال اب وطن واپسی کے آثار شروع ہو چکے تھے، زیادہ تر زائرین اپنے اپنے دیس کو سدھار چکے تھے اس لیے اب تمام نمازیں نہایت آسانی اور باقاعدگی سے حرمِ پاک میں ادا ہوتیں، ہر نماز کے بعد قرآن کے ایک پارے کی تلاوت اور خانہ کعبہ کا طواف گویا والدہ اور میں نے اپنے اوپر فرض کر لیا تھا۔ ساتھ ساتھ شامیہ مارکیٹ سے

www.urduchannel.in

ایک اٹیچی خرید کے، ذاتی استعمال کے سامان کی پیکنگ بھی شروع کر دی تھی۔

یکم دسمبر ۲۰۰۳ء کو ظہر کے بعد خوب بارش ہوئی۔ یہ سلسلہ کسی نہ کسی طرح عشا کے بعد تک جاری رہا۔ لگتا تھا اس برس مکہ میں بارشوں کا ریکارڈ قائم ہونے جا رہا ہے۔ دو دسمبر کا سارا دن بھی تقریباً حرم میں گزرا۔ جی بھر کے اپنے اور بہت سے احباب کے نام کے طواف کیے۔ تین نومبر فجر کی نماز حرم میں ادا کر کے واپس ہوٹل میں آ کے سامان سمیٹا۔ آج چونکہ واپسی کا امکان تھا، اس لیے نو بجے دوبارہ حرم میں آ کے الوداعی طواف کیا۔ بہت سی دعائیں مانگیں۔ واپس ہوٹل آیا تو جدہ سے ٹکٹیں اوکے ہونے کی خبر آ گئی۔ احباب کو مطلع کیا۔ ہوٹل کا بل ادا کر کے چیک آؤٹ کیا۔ نوے ریال میں ٹیکسی کرائی۔ اہل مکہ اور حرم کو الوداعی سلام کر کے پونے گیارہ بجے جدہ کے لیے روانہ ہوئے۔ سوا بارہ بجے جدہ خارجی انٹرنیشنل ائیر پورٹ پر محمود، حبیب اور ایوب ہمارے ٹکٹ لیے موجود تھے۔ وہاں پہ سامان کلیئر کروایا اور فلائٹ کے انتظار میں بیٹھ گئے۔

❁❁❁

خروج

آج ٹھیک چونتیس دن بعد بالآخر جدہ ائیر پورٹ سے ہمارے پاسپورٹ پر خروج کی مہر لگی۔ کچھ انتظار کے بعد قطر ائیر ویز کی فلائٹ نمبر ۷۶۷ پر سوار ہوئے۔ ٹھیک ۵:۴۵ پر مذکورہ پرواز نے اڑنے کے لیے پر کھولے بلکہ صحیح معنوں میں پر تولے، پھر کچھ ہی دیر بعد دھرتی کے سینے پر دو تیکھی لکیریں کھینچتے ہوئے جہاز نے زمین کا ساتھ چھوڑ کر فضا کا سینہ چیرنے کا عزم باندھا۔ فضا سے اس کی دوستی پونے دو گھنٹے تک جاری رہی۔ اس دوران جہاز کے اندر کھانے پینے کا سلسلہ چلتا رہا۔ بیف، چاول، مچھلی، کوک اور چائے وغیرہ پر مشتمل لنچ، انھوں نے جہاز ہی میں پیش کیا۔ اب کے میری سیٹ کھڑکی کے ساتھ والی تھی، جس میں سے بادل، دُھنکی ہوئی روئی کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ شہر کھلونوں کے بڑے بھائی محسوس ہوتے تھے اور چلتی پھرتی اشیا پہ کیڑے مکوڑوں کا گمان ہوتا تھا۔ وہاں اس بات کا ادراک بھی ہوا کہ بلندی، جہاز کی ہو یا عہدے اور دولت کی، اوپر والوں کو نیچے والے کیڑے مکوڑوں کے سمان ہی دکھائی دیتے ہیں..... شام کا کھانا قطر کے انٹرنیشنل ایئر پورٹ پر دیا گیا، جہاں بین الاقوامی ہوائی اڈا ہونے کی بنا پر خاصی چہل پہل رہتی ہے اور مغربی تہذیب کا جوبن چاروں جانب انگڑائیاں لیتا دکھائی دیتا ہے۔

ہماری قطر ائیر ویز کی پرواز کو صبح دو بج کر پینتالیس منٹ پر پشاور کے لیے اڑان بھرنا تھی۔ لاہور کی فلائٹ ایجنٹ حضرات کی غفلت، لاپروائی یا شاید کسی چھوٹے موٹے دنیاوی فائدے کی وجہ سے ممکن نہ ہوئی۔ تمام لوگ سوار ہو گئے تو ہوائی ڈرائیور (پائلٹ) نے موسم کو عاشقانہ قرار دیتے ہوئے، اپنے معصوم طیارے کو سرپھری ہواؤں کے طلسم سے محفوظ رکھنے کے لیے تاخیر کے منتر کا بر وقت استعمال مناسب سمجھا۔ کھڑکی سے باہر نظر کی تو تیز بارش اور سرکش ہوا میں باقاعدہ ٹھنی ہوئی تھی۔ بارشوں سے یہ دوستی تو ہم مکہ سے ساتھ لے کے چلے تھے۔ لیکن مکہ اور مدینہ سے جو اصل

www.urduchannel.in

دوستی اور سرور ہم ساتھ لائے تھے اور جو، تاحینِ حیات ہمارے لیے سرمایۂ افتخار رہے گا، وہ ہے کلمۂ طیبہ کی تفہیم۔

دوستو! آج مَیں پاک دھرتی کی اِس رُوداد میں پورے مان، ایقان اور ایمان کے ساتھ اقرار کرتا ہوں کہ مکہ اور مدینہ کے ایک ماہ سے زائد قیام میں جو سب سے بڑا خزانہ میرے ہاتھ لگا، وہ یہ تھا کہ:

مکہ میں مجھے **لا الٰہ الا اللّٰہ** کا اصل مفہوم سمجھ میں آیا۔

اور مدینہ کے قیام نے مجھے **محمد الرسول اللّٰہ** کے معنوں کا اِدراک بخشا۔

عربی کی شدھ بدھ اور تحقیق کے بعد کھلا کہ ''الٰہ'' کے تین مفاہیم ہیں:

۱۔ جس کو سجدہ کیا جائے۔

۲۔ جس سے مدد مانگی جائے۔

۳۔ جس سے امید رکھی جائے۔

ان مفاہیم کا اِدراک ہوا تو وہیں ربِ رحیم سے عہد باندھا کہ:

تیرے بِنا جو عمر بِتائی، بیت گئی
اب اِس عمر کا باقی قصہ تیرے نام

دل میں بھی پختہ ارادہ کیا کہ اے خدا! عبادت تو ہم پہلے بھی تیری ہی کرتے ہیں، آج کے بعد اگر کچھ طلب کریں گے تو صرف اور صرف تیری ذاتِ بابرکات سے!! وہ بھی تیرے قرآنی حکم: **واستعینو بالصبر و الصلوۃ** (اور مجھ سے مدد طلب کرو، صبر اور نماز کے ساتھ) کی روشنی میں اور اگر آیندہ زندگی کے کسی معاملے میں کوئی آس، امید اور بھروسہ رکھا جائے گا تو وہ بھی تیری ذاتِ والا صفات سے۔

دوستو! آج مَیں اسی اللہ کو حاضر و ناظر جان کے تسلیم کرتا ہوں کہ دینی شعور کے ان سولہ سالوں میں عقیدے کی اسی پختگی، مزاج کی اسی یکسوئی اور زندگی کی اسی کومٹ منٹ سے باری تعالیٰ نے مجھ ناچیز پہ ایسا ایسا کرم کیا ہے، مجھے میری ضرورتوں سے اتنا وافر عطا کیا ہے کہ مجھے نہ صرف یہ کہ آج تک کسی اور جانب نظر اٹھا کے دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی بلکہ اُس کی

عبادت کرتے ہوئے یہی جی چاہتا ہے کہ:

آج سجدوں کی انتہا کر دوں
شوق مٹ جائے یا جبیں نہ رہے

محمد الرسول اللّٰہ کے الفاظ سے مجھ پر عقدہ کھلا تھا کہ پیارے محمد ﷺ عربی کا ایک ایک عمل اور ایک ایک بات اللہ کے حکم کے عین مطابق تھا اور ہمیں اپنے ذاتی و دنیاوی مفادات سے بالا ہو کر زندگی کے ہر معاملے میں نبی ﷺ کی سنت اور سمت کو سامنے رکھنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ مرضی کی بات آئی تو عاشقِ رسول بن گئے۔ مزاج، رواج اور سماج پہ زَد پڑتی دیکھی تو آنکھیں بند کر لیں۔ مَیں یہ بھی محسوس کیا کہ آپ ﷺ کی سُنّت اور سَمت پہ مکمل طور پر عمل کرنے کے راستے میں ہماری ذاتی عادات، خاندانی روایات اور گھڑی گھڑائی حکایات، سب سے زیادہ حائل ہیں۔

❁❁❁

www.urduchannel.in

55

چلتے چلتے.....

اپنے اس سفر اور قیام کے دوران پیش آنے والے کچھ واقعات و تجربات:

☆ حج اور عمرے کے موقع پر ایک مشکل مرحلہ، حجرِ اسود کو بوسہ دینا ہے، جسے بعض افریقی اور پاکستانی بھائیوں کے فلمی ٹکٹیں لینے والے سٹائل نے مشکل تر بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں خواتین کو بجا طور پر کہتے پایا کہ یہاں ان کے ساتھ انصاف نہیں ہوتا کیونکہ ایک تو مرد حضرات دھکم پیل میں ان کی باری نہیں آنے دیتے، اور اگر وہ کوشش، ہمت سے سرکتے سرکتے قریب پہنچ جائیں تو اکثر جماعت کا وقت ہو جاتا ہے، جس کے لیے ان کو پچھلی صفوں میں جانا ہوتا ہے اور نماز کے بعد مرد پھر قابض ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں سعودی حکومت کو قطار سسٹم رائج کرنا یا خواتین کے لیے الگ اوقات مقرر کر دینے چاہئیں۔

☆ اس سفر میں کئی طرح کے زائرین سے واسطہ پڑتا ہے: ان میں سے ایک طبقے کو ہم ''عادی حاجی'' کہہ سکتے ہیں، جو حج اور عمروں کا ریکارڈ قائم کرنا چاہتے ہیں، دوسرے نمبر پر پیسے والے خواتین و حضرات ہیں، جو اپنی جیسی تیسی کمائی کو ''نیک کام'' میں استعمال کرنا چاہتے ہیں، تیسرے نمبر پر وہ خوش فہم لوگ ہیں جنھیں محلے کے مولوی نے بتا رکھا ہے کہ عمرہ کرنے کے بعد، بندہ گناہوں سے ایسے پاک ہو جاتا ہے، جیسے ابھی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے، ان سب کے لیے پہلی بات تو یہ کہ دنیا و آخرت کے کسی معاملے میں بھی، مقدار کی نہیں، معیار کی اہمیت ہے، اعمال سے زیادہ نیتیں دیکھی جائیں گی اور دوسرے نمبر پر یہ کہ جن گناہوں سے معافی کا بتایا گیا ہے، ان سب کا

تعلق حقوق اللہ سے ہے، نماز، روزے میں کوئی کمی کوتاہی ہو گئی ہو تو شاید قادرِ مطلق درگزر فرما لے۔ جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے، وہ ہزار حج، عمرے کرنے سے بھی معاف نہیں ہوں گے۔ مَیں نے کسی زمانے میں لکھا تھا:

''عمروں کے گناہ ''عمروں'' سے معاف نہیں کروائے جا سکتے۔''

☆ یہ بھی دیکھا کہ عربی حضور ﷺ پر ہم سے زیادہ درود بھیجتے ہیں، فرق یہ ہے کہ وہ: **الصلوۃ والسلامُ علیٰ رسول اللّٰہ** کہتے ہیں اور ہم اپنی ضد، جہالت، کم علمی اور فرقہ بازوں کے سِدھائے ہوئے **الصلوۃ والسلامُ یا رسول اللّٰہ** کہتے ہیں۔

☆ مَیں کوئی بہت مذہبی آدمی نہیں ہوں لیکن مَیں اپنے کھلی آنکھوں کے مطالعے سے اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہم پاک و ہند کے لوگوں نے دین، قرآن و سنت کی بجائے سنی سنائی باتوں سے سیکھا ہے، پھر اس میں ہندی کلچر کی ملاوٹ، کم علم علما کی ذاتی مفادات پر مشتمل بدعات، کچھ ہماری مقامی عادات نے مل جل کر اسے کچھ کا کچھ بنا دیا ہے.....

قابلِ فکر بات یہ کہ ہمیں اس پر غور کرنے اور اصل حقیقت تک پہنچنے کی فرصت بھی نہیں۔

☆ مَیں نے اپنی اب تک کی عمر اور اِس عمرے سے یہی سیکھا ہے کہ اللہ سے بڑا داتا کوئی نہیں، نبی ﷺ سے بڑا مُرشد کوئی نہیں اور قرآن سے بڑی ہدایت کوئی نہیں لیکن افسوس کہ ہم نے ان تینوں سرچشموں کے گرد محض اندھی عقیدت کا ہالہ بُن رکھا ہے۔

☆ یہاں مکہ اور مدینہ میں نمازِ تراویح میں، **سبحانک اللّٰہ** صرف پہلی رکعت میں پڑھی جاتی ہے، اس کے بعد ہر رکعت، الحمدللہ سے شروع ہوتی ہے۔

☆ مکہ میں پاکستانی سفارت خانے کا کردار اور کارکردگی پاکستان کے سرکاری دفاتر سے ذرا مختلف نہیں، اُس کو مفادِ عامہ کے لیے فعال بنانے کی اشد ضرورت ہے۔

☆ پاکستان میں حج عمرے کا انتظام و انصرام کرنے والے ایجنٹ حضرات، بھولے بھالے زائرین کو بہت ذلیل کرتے ہیں، حکومتِ وقت کو اس کا بھی خصوصی نوٹس لینا چاہیے۔

❁❁❁

www.urduchannel.in

56

0000

آخری بات.....

اِس کتاب کے آخر پہ میری اپنے احباب، قارئین، زائرین، مصنفین، مفسرین، مترجمین، سیرت نویس اور سفرنگار خواتین وحضرات سے یہی استدعا ہے کہ دنیا کا ہر مذہب انسان کی فلاح اور سلامتی کا درس دیتا ہے اور بالخصوص دینِ اِسلام ہمیں ساری عمر سیکھنے، خود کو قران وسُنّت کے مطابق بدلنے اور دلوں کو جوڑنے کی تلقین کرتا ہے۔ یہ دین نہایت سادہ، سیدھا اور انسانیت کی فلاح کے لیے اتارا گیا تھا اور اس میں قیامت تک آنے والے لوگوں کے لیے ہدایت اور راہنمائی موجود ہے۔

ہم میں سے بہت سے لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ بالآخر ایک دن اسلام ہی غالب آئے گا۔ ہم اس بات پہ غور نہیں کرتے کہ اللہ باری تعالیٰ نے اسلام کے غلبے کا وعدہ کیا ہے، بھٹکے ہوئے لوگوں کے غالب آنے کا نہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ وہ ہماری اسی جہالت اور ہٹ دھرمی سے مایوس ہو کر کسی دنیاوی طور پر غالب قوم کو اسلام کا شعور عطا کر دے اور ہماری داستاں تک بھی نہ ہو داستانوں میں !!!

سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہمارا دین عربی میں اُترا تھا اور ہم اس کو اپنے ہندی اور مقامی ماحول کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے رہے، جس سے ذات پات اور گروہوں میں بٹ گئے۔ میری گزارش ہے کہ آج بھی جو لوگ دلوں میں فرقہ بازی، ہٹ دھرمی، خاندانی اور علاقائی تعصب کا بیج بو کے ارضِ مقدس کا سفر کرنا چاہتے ہیں، اُن کے لیے نہایت مخلصانہ مشورہ ہے کہ وہ اِس قیمتی وقت اور ذاتی پیسے سے کوئی اور منافع بخش کام کر لیں۔

وما علینا الالبلاغ المبین

❁❁❁

مصنف کا ادبی سفر

۱۔	قلمی دشمنی	(طنز ومزاح)	۱۹۹۲ء(اول)
	قلمی دشمنی	(طنز ومزاح)	۲۰۰۶ء(چہارم)
۲۔	ذاتیات	(خاکے،مزاحیے)	۱۹۹۷ء(اول)
	ذاتیات	(خاکے،مزاحیے)	۲۰۱۹ء(سوم)
۳۔	خاکہ نگری	(خاکے)	۲۰۰۳ء
۴۔	اردو نثر میں طنز ومزاح	(تحقیق وتنقید)	۲۰۰۴ء
	اردو نثر میں طنز ومزاح	(تحقیق وتنقید)	۲۰۱۴ء(دوم)
۵۔	خودستائیاں	(خودنوشت خاکے)	۲۰۰۴ء
۶۔	محمد خالد اختر، شخصیت وفن	(تحقیق وتنقید)	۲۰۰۶ء
۷۔	غزل آباد	(تحقیق وانتخاب)	۲۰۰۷ء
۸۔	شفیق الرحمٰن، شخصیت وفن	(تحقیق وتنقید)	۲۰۰۸ء
۹۔	منٹو اور مزاح	(تحقیق وتدوین)	۲۰۰۷ء۔۱۵(تین ایڈیشن)
۱۰۔	خاکہ مستی	(طنز ومزاح)	۲۰۰۹ء
۱۱۔	عطاء الحق قاسمی، شخصیت وفن	(تحقیق وتدوین)	۲۰۱۰ء
۱۲۔	نعت گوئی کے آداب	(تدوین وتسوید)	۲۰۱۰ء(متعدد ایڈیشن)
۱۳۔	موقف	(تنقیدی وتحقیقی مضامین)	۲۰۱۲ء
۱۴۔	کلیدِ اردو	(تحقیق وتدریس)	۲۰۱۳ء(اول)
	کلیدِ اردو	(تحقیق وتدریس)	۲۰۱۹ء(نہم)
۱۵۔	اصنافِ نظم ونثر	(تحقیق وتہذیب)	۲۰۱۴ء(اول)
	اصنافِ نظم ونثر	(تحقیق وتہذیب)	۲۰۱۹ء(سوم)
۱۶۔	عالم میں انتخاب	(منتخب مضامین یوسفی)	۲۰۱۹ء(اول)
۱۷۔	نوعیت	(تنقیدی وتحقیقی مضامین)	۲۰۱۹ء
۱۸۔	جواماں ملی تو کہاں ملی	(سفرنامۂ حجاز)	۲۰۱۹ء
۱۹۔	خاکہ زنی	(خاکے،مزاحیے)	(زیرِطبع)
۲۰۔	سو صفحے کی زندگی	(آپ بیتی)	(زیرِطبع)
۲۱۔	مجال	(شاعری)	(زیرِطبع)

www.urduchannel.in

57

0000

کوائف ڈاکٹر اشفاق احمد وِرک

نام: اشفاق احمد وِرک

والد کا نام: نذیر احمد وِرک

تاریخِ پیدائش: بمطابق سند: ۳/جون ۱۹۶۳ء ...... اصل: ۳۰/دسمبر ۱۹۶۴ء

جائے پیدائش: حنیف کوٹ ضلع شیخوپورہ (پنجاب) پاکستان

تعلیم:

میٹرک:	گورنمنٹ طارق ہائی سکول شیخوپورہ	۱۹۷۹ء
ایف اے:	گورنمنٹ کالج شیخوپورہ	۱۹۸۳ء
بی اے:	گورنمنٹ کالج شیخوپورہ	۱۹۸۵ء
ایم اے (اُردو):	پنجاب یونیورسٹی، لاہور	۱۹۸۸ء
پی ایچ۔ڈی:	پنجاب یونیورسٹی، لاہور	۲۰۰۳ء

موضوع: اُردو نثر میں طنز و مزاح

پیشہ ورانہ مصروفیت: پروفیسر (اُردو)

ادبی مشاغل: مزاح نگار، خاکہ نویس، محقق، نقاد، شاعر، کالم نگار

علمی ادبی مصروفیات: بانی ممبر ''دریچہ'' شیخوپورہ، جس کے پندرہ روزہ اجلاس گزشتہ ربع صدی سے جاری ہیں

معاون مدیر ''مخزن'' لاہور

ممبر بورڈ آف گورنرز لاہور آرٹس کونسل، لاہور

ممبر بورڈ آف سٹڈیز (متعدد جامعات)

ممبر/ایکسپرٹ ریسرچ جرنلز (متعدد جامعات)

کتب: بیس کتب کی تفصیل کتاب کے صفحہ نمبر ۶ پر درج ہے

رسائل و جرائد: پاک/بھارت کے تیس سے زاید رسائل میں تخلیقی و تحقیقی تحریریں شایع ہو چکی ہیں

رابطہ: فون: ۰۳۲۱۔۴۴۳۳۴۳۴

ای میل: drashfaqvirk@gmail.com

موجودہ پتا: ۳۴۵۔رضا بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور